اسد محمد خاں کے اعزازات

تمغۂ امتیاز 2009
عالمی فروغِ اُردو ادب ایوارڈ، دوحہ (قطر) 2007
شیخ ایاز ایوارڈ برائے ادب 2007
احمدندیم قاسمی ایوارڈ برائے فکشن 2004

فیروز شاہ تغلق دارالشوریٰ میں آنجہانی محمد تغلق کی بخشش کے لیے نقرئی سکّوں کے عِوض رعایا کے معافی نامے خرید رہا ہے۔ حاضرین میں اٹھارہ، بیس سال کی ایک چادر پوش لڑکی بھی ہے جو باقی لوگوں کے برعکس خود سے کیا ایک وعدہ پورا کرنے آئی ہے ~ کرائے دار، بیساکھی والا، مرشد، قتل، ہووپ۔ کہانی گو الفاظ کی مدد سے اپنے وقت کے مشہور جیب کترے اور نوسر باز کی کہانی سناتا ہے ~ دو ٹورسٹ ایک ویرانے میں جانکلے ہیں جہاں ایک عورت اپنے چیتے کے ساتھ رہ رہی ہے ~ شیر شاہ سوری کے دورِ حکومت میں مالوہ کی ایک شراب کی بھٹّی میں ایک قصاب کی ملاقات ایک نقلی ٹھاکر سے ہوتی ہے ~ ایک قبائلی قتل کی ثالثی میں نوجوان 'الف' زئی ثالث عجیب فیصلہ سناتا ہے...

ایک قدیم زمانے کے ماحول اور کرداروں کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرنا کہ ہمیں مانوس معلوم لگیں اسد محمد خاں کے تخیل اور قلم کا کمال ہے۔ قاری ایک ہی جست میں سیکڑوں سال پہلے پہنچ جاتا ہے جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی طلسمی دوربین آ گئی ہو۔

فکشن
الفا پبلیکیشنز
ریڈنگز کا اشاعتی ادارہ
ISBN 978-969-9473-37-1

www.readings.com.pk
Rs. 195

ربِ لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+

اسد محمد خاں 1932 میں بھوپال (بھارت) میں پیدا ہوے۔ تقسیم کے بعد 1950 میں پاکستان آ گئے۔ کچھ وقت لاہور میں رہنے کے بعد کراچی منتقل ہو گئے جہاں ملازمت کے دوران تعلیم مکمل کی۔ خاں صاحب کی تحریریں قریب قریب ادب کی سبھی اصناف میں موجود ہیں جن میں افسانے، شاعری، ریڈیو کے لیے خاکے، ٹیلی ویژن کے لیے سیریل، طویل دورانیے کے کھیل، گیت اور ملی نغمے شامل ہیں۔ ان کی اکیس کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے جو "The Harvest of Anger and other Stories" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔

اسد محمد خاں نے اپنے طویل ادبی سفر کے دوران متعدد ادبی ایوارڈ حاصل کیے جن میں پاکستان کا اعلیٰ سول ایوارڈ ''تمغۂ امتیاز'' (2009) بھی شامل ہے۔ اُن کی ایک کہانی ''ترلوچن'' برطانیہ کے اولیول کے نصاب میں بھی شامل رہی۔ وہ کراچی میں سکونت پذیر ہیں۔

اسد محمد خاں کی دوسری کتابیں

کہانیاں

- غصے کی نئی فصل
- کھڑکی بھر آسمان
- برجِ خموشاں
- نربدا اور دوسری کہانیاں
- ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی
- اک ٹکڑا دھوپ کا
- The Harvest of Anger and other stories
(English Translation of Asad Muhammad Khan's 21 stories)

شاعری

- رکے ہوئے ساون

تیسرے پہر کی کہانیاں

اسد محمّد خاں

القا پبلیکیشنز
رِیڈنگز کا اشاعتی ادارہ
لاہور

موجودہ ایڈیشن

اِلقا پبلیکیشنز 2015ء

'اِلقا پبلیکیشنز' اور 'ریڈنگز' الان وتال پرائیویٹ لمیٹڈ کے ذیلی ادارے ہیں۔

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبر (ISBN)
978-9-69-947337-1

سرورق: فاطمہ سعید

خطاطی: نوری نستعلیق

طباعت
وارث پرنٹرز، سوہن سنگھ سٹریٹ، گوالمنڈی، لاہور

اِلقا پبلیکیشنز

K-12، مین بلیوارڈ، گلبرگ 2، لاہور 54660
پاکستان

فون: 92 42 3575 7877
فیکس: 92 42 3575 5576
publications@readings.com.pk
www.readings.com.pk

بڑے کہانی کار نیر مسعود صاحب کے نام

فہرست

دریا اب میرا ہوا (نظم)	1
دارالخلافے اور لوگ	3
ماشٹر	25
تصویر سے نکلا ہوا آدمی	30
روپالی	47
اپنے لوگوں سے سُنی ایک شگفتہ کہانی	59
عون محمد وکیل، بے بے اور کاکا	63
کِھلتی دھوپ اُجلتے سائے	77
شہرِ مُردگاں — ایک کومپوزیشن	81
ایک بلیک کومیڈی	88
گنجے ایڈورڈ کا سورج	93
جنابِ صدر، گلاب کی پتیاں اور گڑ کیری کا شربت	99
سفید گایوں کا مسیا کر	103
ایک تحریر... آئی وو آندریچ	108

تو کہ فلسِ ماہیِ حیرتی چہ زنی ز بحرِ وجود دَم
بنشیں چو طوطی و دَمبدم بشنو خروشِ نہنگِ لا
(قرۃ العین طاہرہ)

دریا اب میرا ہوا (نظم)

مئی سن پچاس میں کسی دن ریل میں بیٹھ کے اور ٹھنڈی ریت پہ چل کے باڑ میر سے میں کھوکھر و پار،
پھر حیدر آباد کے محلّے ہیر آباد آیا تھا۔ یہیں رہنے، بسنے اور ہو سکے تو یہیں مٹی میں مٹی ہو جانے کو۔
میں اپنا وہ دریا پیچھے چھوڑ آیا تھا جس کے بریجوں پہ میرے پرکھے ڈھائی سو برس آسودہ ہوئے
تھے۔

میں یہاں آیا اور پہلی بار میں نے ماہ مئی کی آسائش میں لہرتے، اینڈتے ہوئے اس مٹیالے
دیوتا... سندھ دریا کو دیکھا۔

میں نے قصباتی حیرت سے ندیوں کے اس سمراٹ کو دیکھا اور سوچا، یہ مجھے کیوں منھ لگانے
لگا؟ ایسی تو کوئی امید نظر نہیں آتی کہ دریا مجھے پیتا لے گا۔

(دریاؤں کا ایسا ہے کہ کوئی دو سو برس میں وہ آدمی کو دوست بناتے ہیں، اس سے پہلے نہیں۔)
میں اپنے پرکھوں کے ڈھائی سو برس نربدا ندی کے پتّوں میں چھوڑ کے آیا تھا۔
سترہ ساڑھے سترہ سال کا یہ آدمی خالی ہاتھ آیا تھا یہاں۔
میں نے سوچا بہت جیوں گا تو پچاس پچپن برس اور جی لوں گا۔ دریا تو اب مجھے نہیں ملنے کا۔
پر سچی بات کہوں؟ — دریا کو میں نے اپنے اور اپنے پیاروں کے دکھوں تکلیفوں میں اور

کڑاکے کی سردی میں اسے بھی گھر ہی میں رکنا چاہیے تھا، یہاں کیوں چلی آئی وہ؟ عجیب لڑکی تھی۔ اپنے دل کا کہا پورا کرنے اس بھیڑ بھڑکے میں خوار ہونے ایسے موسم میں نکل پڑی۔

بستی بستی، محلے محلے، ڈھول نقارے پیٹ کر منادی کرنے والوں اور چوراہوں پر پرچہ لگانے والوں نے کہا تھا کہ سلطان فیروز شاہ تغلق کی دلی خواہش ہے کہ رعایا اپنے گزرے ہوئے راعی، طلب گارِ رحمت محمد تغلق ابنِ سلطان غیاث الدین کی روح کے سکون کے لیے اکٹھا ہو اور پرچوں پر یہ لکھے کہ ہم اپنے ساتھ کی گئی ہر زیادتی معاف کرتے ہیں، مرے ہوئے بادشاہ کے خلاف ہمارے دل میں اب کوئی ملال نہیں۔

منادی میں کہا گیا تھا کہ ہر دین دھرم والوں کی جانب سے یہ ایک نوع کے ثواب کا، ایک پنیہ کا کام ہوگا... اور اس طرح رعایا کی کشادہ دلی اور عالی ظرفی بھی ظاہر ہوگی۔

''ہنہہ! چہ کشادہ دلی! چہ عالی ظرفی!''

دو شب و روز منادی ہوتی رہی تھی اور اب لوگ دارالشوریٰ میں معافی نامے لکھنے آئے تھے۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ اس طرح حاصل کی گئی تحریروں کو وہ سلطان محمد تغلق کے پہلو میں دفن کرا دے گا کہ شاید حساب کے دن اس محمد تغلق کے ساتھ درگزر کی جائے۔ شاید مولا پالنہارا سے معاف کر دے کہ جس کی وجہ سے برسوں پہلے لاکھوں بندگانِ خدا بے در، بے گھر ہوئے، قلاش ہو گئے اور اپنی جان سے گئے جبکہ اس معاملے میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔

سلطان فیروز شاہ کو وزیروں، مشیروں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ لوگوں کو راجدھانی کی اس عمارت تک پہنچانے کے لیے، کہ جہاں مرے ہوئے بادشاہ کے لیے معافی کی تحریریں حاصل کی جانی تھیں، تیز رفتار سواریوں کا بندوبست کیا جائے اور ہر آنے والے کو شاہی خزانے سے دو نقرئی سکے بھی دیے جائیں۔

مشورہ شاید مناسب ہوگا کیونکہ ایک عمر سے افلاس و ناداری کی سختیاں جھیلتے ہوئے ان خانماں برباد بدنصیبوں کے پاس سواریاں چھوڑ، دو وقت کی روٹی کا انتظام بھی نہ تھا کہ وہ روٹیاں باندھ کر گھروں سے معافی نامے لکھنے چل پڑتے۔ وزیروں مشیروں کا کہنا تھا کہ ایسوں کو سہولت پہنچانے

کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔

بعض امرائے سلطنت نے دبے لفظوں میں یہ بھی کہا تھا کہ سواریوں کا بندوبست کرنا تو شاید ٹھیک ہو، مگر سکوں کا لالچ دے کر لوگوں کو اکٹھا کرنا اور ایسی تحریریں لینا کیا راعی اور رعایا دونوں کے مرتبے سے گری ہوئی بات نہ ہوگی؟ کہیں یہ رشوت نہ سمجھی جائے؟ روزِ محشر ان تحریروں کی حیثیت کہیں مشکوک تو نہیں ہو جائے گی؟

سلطان اور اس کے مشیروں کے خیال میں ایسا بالکل نہ ہوگا اور یوں کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

چنانچہ زیبِ اورنگ و رایت، سلطانِ ہند حضرت فیروز شاہ کے اعلان کے بعد قریب کی بستیوں، ٹھکانوں سے بے شمار لوگ پا پیادہ ہی راجدھانی کی طرف چل پڑے۔ دارالشوریٰ کے آگے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگتے جا رہے تھے۔ مفت کی سواریاں بھی لوگوں کو برابر لاتی جا رہی تھیں۔ سب دروازے کھول دیے گئے۔ عورتیں اور مرد ایک دوسرے کو ٹھیلتے، چوکھٹوں میں پھنستے، گرتے پڑتے اندر پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ لشکریوں نے بکتر پوش بازو بڑھا کر اپنے نیزوں سے چلیپا بنا دیے اور اس طرح وقفے وقفے سے ان ہجوم کرتے آنے والوں کے رستے روکنے لگے۔

لڑکی کے چہرے کے آگے ٹھہری ہوئی نیزے کی انی چمک دار پھرکی کی طرح گھومی، رستہ روکنے والے اس لشکری نے بیزاری سے بچنے کو نیزے کی ڈانڈ پر ہاتھ بدلا تھا اور بے دھیانی میں نیزے کے پھل کو گردش دلائی تھی۔

لڑکی نے یوں ہی نظریں اٹھا کر لشکری کے چہرے کی طرف دیکھا۔ عام سا سنولایا ہوا سپاہی چہرہ تھا، کرخت اور مہر و مروت سے عاری۔

اسے ایک اور سنگین چہرے کے خدوخال یاد آ گئے۔ مگر یاد آنے والے اس چہرے میں نرمی اور مروت کی ایک لہر بھی سختی اور صلابت کے ساتھ ساتھ برابر چلتی رہتی تھی جو خبر دیتی تھی کہ اس نقاب کے پیچھے محبت اور مہر و وفا سے آشنا ایک زندہ آدمی موجود ہے۔

''فریاد! کہ وہ زندہ چہرہ گرد ہو گیا۔ واویلا! کہ وہ ایک بار کا ملنے والا بچھڑ گیا۔''

اس یاد آنے والے چہرے نے لڑکی کی آنکھوں میں نیزہ بردار دہقان سپاہی زادے سمیت

سب صورتیں دھندلا دیں۔

شاید سرد کٹیلی ہوا کا ایک جھونکا اس کی آنکھوں میں پانی بھر لایا تھا یا ایسا تھا کہ اس محبت آشنا نرم دل شمشیر زن کے لیے، جو قیامت تک کے لیے بچھڑ گیا، لڑکی کا دل اس بے اختیاری سے دھڑکا تھا کہ آنکھ بھر آئی تھی۔

''چلو چلو... کھڑی کیا ہو! آگے بڑھو... آگے۔'' بالکل پیچھے کھڑی ایک ترش رُو عورت نے دو سخت انگلیوں سے اس کے شانے پر کچوکا دیا... ساتھ ہی ایک بے چین بوڑھا آدمی اسے کندھا مارتا ہوا چوکھٹ پار کر گیا... نیزے والے لشکری نے رستہ کھول دیا تھا۔

بے صبرے دہقانوں، شہریوں نے ہر طرف سے ٹھیلتے ہوئے تنگ دروازے سے اندر پہنچنا شروع کر دیا تھا۔ ترش رُو عورت کی ٹھوکروں سے بچتی، دوسروں کی ایڑیاں کچلتی، کچھ بچتی بچاتی وہ لڑکی کسی نہ کسی طرح دروازے سے دالان میں، پھر ایک دُہری محرابوں والے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کمرے میں بھی جا بجا چوکیاں، شہ نشین اور تخت بچھے تھے جن پر شاہی اہلکار جمے بیٹھے تھے اور لوگ انھیں گھیرے کھڑے تھے۔ دس بارہ آدمی جو ابھی لڑکی کے ساتھ ساتھ داخل ہوئے تھے، بے صبرے بچوں کی طرح کبھی ایک کارندے کی طرف لپکتے، کبھی دوسرے کی طرف۔ سبھی کو معافی نامہ لکھنے اور سکے ہتھیانے کی جلدی تھی۔

چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی ایک ستون سے ٹیک لے کے کھڑی ہو گئی اور لوگوں کو اہلکاروں کی خوشامد کرتے، ان کی تیار کی ہوئی پرچیوں پر اپنے نام اور اپنے باپوں یا شوہروں کے نام لکھتے یا لکھواتے، دستخط کرتے یا انگوٹھوں کے نشان لگاتے دیکھنے لگی۔

کوئی بھی مرد یا عورت، دستخط کرنے یا انگوٹھا لگانے کے ساتھ ہی دو نقرئی سکوں کا حق دار ہو جاتا تھا اس لیے سرکاری گماشتے ایک ہاتھ سے پرچی سنبھالتے دوسرے سے کھنکھناتے ہوئے دو سکے اس کے کھلے ہاتھ پر رکھتے اور مٹھی بند کر کے ایک طرف کو دھکا دے دیتے تھے۔ دوسرا گماشتہ اپنی لاٹھی کے اشارے سے، یا دھیرے سے کچوکا دے کر، وصولی کرنے والے کو بھیڑ سے ہٹا باہر کے رستے پر لگا دیتا تھا۔ اہلکاروں کے حساب سے اب اس مرد یا عورت کا یہاں کوئی کام نہیں تھا۔

عمارت سے نکلتے ہی بہت سے لشکری اور کارندے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح گھیرتے، ہنکاتے ہوئے ایک کھلے احاطے میں پہنچا رہے تھے جہاں دور دور تک خانسامے اور بامن رسوئیے چھولداریاں لگائے بیٹھے تھے۔ انتظام یہ تھا کہ یہاں انھیں کچھ کھلا پلا کے ایک آدھے پہر بعد مفت کی سواریوں میں بٹھا کے ان کے اپنے شہر، قصبے، گاؤں یا موضعے میں یا اس کے آس پاس کہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ دارالخلافہ دِلّی میں اب ان کا کوئی کام نہیں تھا اور جو دوبارہ آ کر اس نامراد شہر میں رہ بس گئے تھے انھیں ابھی اسی احاطے میں رکنا تھا تا آنکہ پرچیاں سنبھالنے کا سارا کام نمٹا نہ دیا جائے۔ شاہی عمال کا خیال تھا کہ اگر ان ''وصول کر چکے'' لوگوں کو راج دھانی میں کھلا چھوڑ دیا گیا تو یہ پھر سے دارالشوریٰ میں گھس آئیں گے اور ایک بار اور مرے ہوئے سلطان کو ''معاف کر کے'' نقرئی سکے وصول لیں گے۔

باہر سے نئے لوگ آ آ کر تحریریں دیتے اور سکے لیتے رہے۔ لڑکی دو ایک بار آگے بڑھی بھی مگر لوگ کسی ترتیب اور تنظیم کے بغیر ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے آنے کے عادی تھے۔ ہر مرتبہ کسی نہ کسی نے اسے ٹھیل کے ایک طرف کر دیا اور خود دستخط یا انگوٹھا ثبت کر کے اپنا کام نکال چلتا بنا۔

لڑکی بے دلی سے کوشش کرنے کے بعد پھر سے خود کو چادر میں لپیٹ کر ستون سے جا ٹکی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آدھا دن خراب کر کے یہاں تک پہنچی ہے اگر مقصد پورا کیے بنا جانا پڑا تو بہت برا ہوگا۔ اس نے ستون کی دوسری طرف آ کر اہلکار کی نشست تک رسائی کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔

محرابوں والے کمرے میں آئے پوری ایک ساعت گزر گئی تھی، اس نے سوچا ہو سکتا ہے اس کمرے میں کچھ زیادہ لوگ آ گئے ہوں، دوسرے کمرے میں کسی دوسری نشست پر کوشش کر دیکھوں۔

وہ چادر سنبھالتی اپنا آدھا چہرہ اور پورا بدن چھپائے ایک کمرے سے نکلی، دوسرے میں داخل ہو گئی۔ خدا پناہ میں رکھے! یہاں تو وہاں سے زیادہ بھیڑ ہے۔

وہ تیزی سے پلٹی اور سیاہ چادر لپیٹے ورزشی بدن والے ایک بلند قامت مرد سے ٹکرا گئی۔

''اللہ!'' لڑکی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

سیاہ چادر میں لپٹے دو ہاتھ تاسف میں بلند ہوئے۔ چادر والے نے گہرے سنجیدہ لہجے میں کہا،

"معافی! خاتون معافی!... شرمندہ ہوں۔"

لڑکی نے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ مرد کی آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں اجلی سبز اور چہرے کی رنگت کھلتی ہوئی گندمی تھی۔ لڑکی نے سوچا، یہ آدمی اُمرا کے طبقے سے ہوگا ورنہ محنت کش، بیوپاری اور لشکری لوگ تو سنولائے ہوئے اور سیاہ آنکھوں والے ہوتے ہیں۔ ان کے قد بھی اتنے نکلتے ہوئے نہیں ہوتے۔

وہ اُمرا کے طبقے سے خوش نہیں تھی، اس نے روکھے پن سے کہا، "آغا کو خدا نے دو آنکھیں عطا کی ہیں۔ اگر دیکھ کر چلتے تو کاہے کو شرمندہ ہوتے۔"

چادر میں لپٹا ہوا مرد جیسے اپنی آنکھوں سے مسکرایا، بولا، "ایک بار ان بے مصرف آنکھوں کی طرف سے بھی معافی مانگتا ہوں... آپ کو نہ دیکھا تھا انھوں نے۔"

مرد نے فقرہ بہت احتیاط سے کہا تھا پھر بھی لڑکی نے اس میں چھپی شرارت پڑھ لی۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ جن آنکھوں نے آپ کو نہ دیکھا، بھلا کس کام کی؟ بے مصرف ہیں یہ آنکھیں۔

لڑکی کا وقتی غصہ ذہانت سے کہے ہوئے اس فقرے نے دور کر دیا۔ اس نے سوچا دارالحکومتوں میں دنیا جہان کے طباع اور ذہین لوگ بھی آ بستے ہیں۔ یہ شخص پڑھا لکھا ہے، اُمرا کے طبقے سے ہے شاہی اہلکار نہیں ہو سکتا... سلطانوں کو تو اپنے ڈھب کے کارندے مطلوب ہوتے ہیں۔ غبی اور لکیر کے فقیر اور سفاک، جو شاہی احکام کی بجا آوری میں خوب مستعد ہوں، ساتھ ہی ہر طرح سے بے عقل بھی ہوں۔ وہی لوگ کچہریوں اور محکموں اور درباروں کے مطلب کے ہوتے ہیں۔

بلند قامت مرد اسی طرح چادر میں اپنے ہاتھ باندھے، لڑکی کے لیے رستہ چھوڑے کھڑا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر چل پڑی۔ مرد نے بہت آہستہ سے پوچھا، "خاتون! کیا کسی کی تلاش میں ہیں آپ؟... اگر میں کسی کام آسکوں تو..."

لڑکی تھکی ہوئی آواز میں بولی، "اتنی بھیڑ ہے... سوچا تحریر حوالے کروں گی... اور چل پڑوں گی... یہاں تو... واللہ!..."

"میرے ساتھ آیئے۔" اجنبی نے مستعدی سے ایک جانب اشارہ کیا۔

لمحے بھر پہلے کا غصہ بھول کر وہ اس کے پیچھے چل پڑی۔

اجنبی نے قریب ترین شہ نشین کا رخ کیا تھا۔ ہاتھوں اور شانوں کی خفیف سی حرکت سے اپنے لیے جگہ بناتا، اپنے سائے میں لڑکی کو لیے وہ لمحے بھر میں اہلکار تک پہنچ گیا۔ گہری، گونج دار، تحکم آمیز آواز میں اس نے کہا، "اے! ادھر!" پھر اس نے اہلکار کے ہاتھ سے ایک پرچہ اچک لیا اور لڑکی کے حوالے کیا۔

شہ نشین کے دو بالشت چوڑے چھجے پر آنے والوں کے لیے دوات قلم رکھ دیے گئے تھے تو اجنبی نے وہیں ہجوم میں اس کے کھڑے ہونے کی جگہ بھی بنا دی پھر نرمی سے چادر میں لپٹا ہوا اپنا ہاتھ اس کے کندھے سے مس کر کے کہا، "آگے آیئے" اور احتیاط سے بدن چرائے ہوئے اسے آگے بڑھا کر وہ شہ نشین چھوڑ کر خود ہجوم سے نکل آیا۔

لڑکی نے پرچے پر ایک نظر ڈالی، شاہی اہلکار سے بولی، "مجھے سادہ کاغذ دو، اس پر تو پہلے ہی کچھ لکھا ہے۔"

"ایں؟" اہلکار نے حیرت اور کم عقلی میں آنکھیں پٹپٹائیں، "ہاں، لکھا ہے۔ تمھاری آسانی کے لیے ہم نے معافی کا جملہ لکھ دیا ہے۔ دستخط کر کے ہمارے حوالے کرو۔ جلدی!" لڑکی نے الجھ کے کہا، "تمھارے لکھے پر دستخط نہیں کروں گی میں۔ اپنا لکھوں گی، مجھے سادہ کاغذ دو۔"

اہلکار نے ایک نظر اس پر، دوسری ہجوم سے باہر کھڑے بلند قامت آدمی پر ڈالی، ہلکے چڑچڑے پن سے بولا، "اچھا اچھا بی بی! سادہ کاغذ لے لو... ہم نے تو تم لوگوں کی آسانی کے لیے... لو سنبھالو... جلدی کرو۔"

اس نے کاغذ لے لیا اور اہلکار کا لکھا پرچہ موڑ توڑ کے نیچے ڈال دیا۔ برابر کھڑے ایک موٹے سیاہ فام شہری نے جو ساہوکاروں جیسا لگتا تھا، "اے اے۔ فینکتی کیوں ہو؟" کہتے ہوئے جھک کر پرچہ اٹھا لیا اور ایک طرف کھڑے ہو کر اس پر انگوٹھا لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

سیاہ چادر والا ہجوم کے سروں پر سے نظر ڈالتا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

لڑکی نے چھجے پر کاغذ پھیلا کر لکھنا شروع کیا... اس نے لکھا، "بسمہٖ تعالیٰ۔ میں خدا کی بندی

صنوبر جاہ بنت خیرالدین مرزا، رحلت کیے ہوئے بندے محمد تغلق ابنِ غیاث الدین شاہ کو جو برسوں پہلے ممالکِ ہند کا بادشاہ تھا، لاکھوں بندگانِ خدا کی مصیبت اور ابتلا کا اور ہزاروں کی موت کا واحد ذمہ دار ٹھہراتی ہوں اور اس منصفِ اول و آخر کے روبہ رو کہ جو شر کی سزا اور خیر کا انعام دینے والا حاکمِ مطلق ہے، محمد تغلق شاہ کو مجرم گردانتے ہوئے فریادی ہوں کہ مجھ بدنصیب کے اٹھارہ پیاروں کی الم انگیز موت کا حساب اس بادشاہ محمد تغلق سے لیا جائے کہ اس بے رحم نے...''

''ارے یہ کیا لکھ رہی ہے؟ عورت! اے عورت! او دروغہ! میر باشی! اے نایک! لینا۔ پکڑنا اسے۔ یہ مرحوم سلطان کے لیے کوسنے لکھتی ہے... لکھتی ہے محمد تغلق شاہ ظالم تھا۔ لکھتی ہے خدا سلطان کی پکڑ کرے۔ ارے یہ کہاں سے آگئی۔ چنڈالنی؟ اے دروغہ! اے'' شاہی اہلکار نے شہ نشین پر کھڑے ہو کر شور کرنا شروع کر دیا تھا۔ کھلبلی مچ گئی۔

لڑکی، جس نے اپنا نام صنوبر جاہ لکھا تھا، سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے سطر مکمل کی۔ نیچے دستخط کیے اور وہ پرزہ اہلکار کی طرف بڑھا دیا، بلند آواز سے کہنے لگی، ''نقرئی سکوں سے خریدے گئے جھوٹے معافی ناموں کے ساتھ میری یہ فریاد رکھ دینا اور سلطان تک یہ بات پہنچا دینا کہ وہ اپنے عم زاد محمد تغلق کے لیے صرف دعائے خیر کرے... چاندی خرچنے سے مغفرتیں نہیں ملتیں۔''

کچھ فاصلے پر کھڑے بلند قامت اجنبی نے سب کچھ دیکھ اور سن لیا تھا۔ وہ قدم بڑھا کر بھیڑ میں داخل ہونے والا تھا کہ سرخ شلوکے والے چار عسکریوں نے ہجوم میں رستہ بناتے ہوئے برق رفتاری سے اس لڑکی کو جا لیا۔ ایک نے اپنی کمر سے چلے کی ڈوری کھینچ کر نازک اندام لڑکی کی مشکیں کس دیں، دوسرے عسکری نے اہلکار کے ہاتھ سے لڑکی کا لکھا رقعہ حاصل کیا، پڑھا پھر سانپ کی طرح سرسراتے لہجے میں پوچھا، ''تمھارا نام صنوبر جاہ ہے؟''

لڑکی نے کہا، ''ہاں۔''

''صنوبر جاہ بنت خیرالدین مرزا! میں دستۂ خاص کا کماں دار، مسندِ عالی، حضرت سلطانِ ممالکِ ہند کے نام پر تمھیں گرفتار کرتا ہوں۔'' اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ چار عسکری صنوبر جاہ کو گھیرے میں لیے ہوئے عمارت سے نکلنے کو چلے۔ کشاں کشاں لے جائی جاتی اس لڑکی نے ہجوم پر سرسری سی نظر

ڈالی۔ اسے بلند قامت اجنبی نظر نہ آیا۔ سوچنے لگی ٹھیک تو ہے، سرخ شلوکے والوں کو دیکھ کے اِدھر اُدھر ہو گیا ہو گا۔

قیدخانے کی چھت نیچی تھی۔ دیوار کے طول میں دو ڈھائی بالشت کا تنگ چبوترہ بنا تھا، جس پر پیال کا ایک گدا جیسا ڈال دیا گیا تھا۔ یہ اس کا بستر تھا اور یہی بیٹھنے کی چوکی بھی۔ ٹیڑھے ترچھے پتھر جما کر بنایا گیا فرش اس درجہ ناہموار تھا کہ بے دھیان ہو کر کوئی چلے تو ضرور ٹھوکر کھا جائے۔ اس فرش پر بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ ایک طرف کونے میں آبخورے سے ڈھکا چھوٹا سا گھڑا اٹکا ہوا تھا۔

یہ تھی قیدخانے کی کُل دنیا۔

صنوبر نے اس تنگ بستر پر احتیاط سے پہلو بدلا اور زیرِ لب تسبیح کی، ''سبحان اللہ!''

یہ اس کے بابا مولائی خیرالدین نے سکھایا تھا۔ کہتے تھے کہ آسائش میں رب کی تسبیح تو سبھی کرتے ہیں لیکن صابرین کی تعلیم یہ ہے کہ آزمائش اور اِبتلا میں اپنے خدا کی ثنا زیادہ کی جائے۔ اس تسبیح کا مزہ ہی اور ہے۔

اپنے مرحوم بابا کو یاد کر کے صنوبر جاہ نے پھر ایک بار سبحان ربی کہا اور چادر کے گوشے سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔

اٹھارہ انیس برس کی کم ہی لڑکیاں ایسی ہوتی ہوں گی جیسی یہ لڑکی تھی۔ وہ اگر مولائی خیرالدین مرزا کی بیٹی نہ ہوتی، اگر اس نے تغلقوں کے پرشور زمانے میں ہوش نہ سنبھالا ہوتا، اگر اس کے گھر کے اٹھارہ مرد عورت بچے جابر بادشاہوں کے انتقام اور جنون اور بے حسی کی بھینٹ نہ چڑھ گئے ہوتے تو صنوبر اور ہی لڑکی ہوتی... ایک عام سی لڑکی۔ اپنا یا اپنے ماں باپ کا گھر سنبھالنے والی۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر خوش اور ذرا سے صدمے سے آبدیدہ ہو جانے والی۔

اور وہ دارالشوریٰ کے اس کمرے میں ہجوم کے ساتھ قطعی داخل نہ ہوتی... اور ہرگز وہ عبارت نہ لکھتی جس کی وجہ سے دستۂ خاص کے ہاتھوں گرفتار ہو کر یہاں پہنچی تھی۔

یہ عیسوی سال 1351 تھا۔ سلطان محمد تغلق باغیوں کا پیچھا کرتے ہوئے مرضِ موت میں مبتلا

ہوا اور اس نے سندھ میں وفات پائی۔ سلطان کی میت تدفین کے لیے دِلّی کے قریب قلعہ تغلق آباد
میں پہنچادی گئی۔ محمد تغلق نے اپنی زندگی ہی میں اپنے چچیرے بھائی فیروز کو جانشین نامزد کر دیا تھا۔
فیروز شاہ نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ پرانی راجدھانی دِلّی کی طرف کوچ کیا۔ کس لیے کہ وہیں اس
کے عم زاد محمد تغلق کی تدفین ہونی تھی۔ وہ شہر پھر ایک بار تغلقوں کا پایۂ تخت بن گیا تھا۔ خواہش کے
باوجود یہ نامزد کردہ سلطان، متروک کیے دارالخلافے دولت آباد (یا دیوگری) نہیں جا سکتا تھا جہاں
اس وقت اس کے گھر والے تھے۔

عم زاد محمد تغلق نے اس ایک شہر دیوگری کو بسانے کے لیے لاکھ سوا لاکھ گھر ویران کیے تھے۔
رعیت میں سے کتنے ہی لاکھ نفوس ایک سخت گیر سلطان کا حکم بجالانے کو ویرانوں میں بھٹکتے پھرے
تھے، پھر ہزاروں کو وہیں موت نے آلیا تھا۔

دِلّی اور تخت شاہی کی طرف سفر کرتے ہوئے نیا سلطان فکرمند تھا، سوچتا تھا کہ کہیں وہ کسی
نحوست کی طرف تو قدم نہیں بڑھا رہا۔

وہ سنتا آ رہا تھا، لوگ چوری چھپے سرگوشیوں میں بھی اور کبھی برملا بھی، کہتے تھے کہ محمد تغلق قہر خداوندی
ہے جو ہماری شامتِ اعمال سے ایک ہاتھ سے خلعتیں اور دوسرے سے موت بانٹ رہا ہے۔ اس کا تخت
انسانی ہڈیوں پر استوار ہے۔

خیر، نامزد سلطان فیروز شاہ نے گھوڑے کی پشت پر راتوں رات مسافت طے کرتے ہوئے
خود سے عہد کیا کہ میں راجدھانی پہنچ کر یہ سب بدلنے کی کوشش کروں گا۔ مصیبت جھیلے ہوئے لوگوں
کے زخموں پر مرہم رکھوں گا اور کیونکہ فیروز شاہ اپنے عم زاد محمد تغلق سے واقعی محبت کرتا تھا، اس لیے
اسے یقین تھا کہ وہ مصیبت اٹھائے ہوئے لوگوں کے دل مٹھی میں لے لے گا تو وہ ضرور گزر چکے
سلطان کو معاف کر دیں گے۔

فیروز شاہ کو اندازہ نہیں تھا کہ محمد تغلق کے لیے لوگوں سے معافیاں ''حاصل'' کرنے میں اسے
بیس برس لگ جائیں گے۔

اس نے یہ بہت بڑا کام اپنے ذمے لیا تھا۔ دلوں سے اس بربادی کا داغ دھونا ہی کافی نہیں

تھا۔ محمد تغلق کے اور بھی اعمال تھے جن کی نحوست نے ایک کے بعد دوسری نسل پر اپنا سایہ ڈال دیا تھا،
انھیں عامیوں کے ذہنوں سے محو کرنا کیسے ممکن ہوگا۔

اس کج فکر بادشاہ نے ایک حکم کے ذریعے چاندی کے سکے کی جگہ تانبے کا سکہ جاری کیا تھا اور
نئے سکے کی ایک خیالی قیمت مقرر کی تھی۔ حکم دیا تھا کہ آج سے مہر کیا ہوا تانبے کا یہ ٹکڑا چاندی جتنی
قیمت رکھتا ہے۔

عامی، آجر، تاجر، چھوٹے بڑے بیوپاری سب قلاش ہو گئے۔ دکانوں میں، بازاروں میں
دھول اڑنے لگی۔ گوداموں میں پڑے پڑے مال مٹی ہو گیا۔ سمجھ کام نہیں کرتی تھی کہ ملک میں کاروبار
پھر سے کب اور کس طرح بحال ہوگا۔ سرحدوں پر آنے والے تجارتی قافلے یا تو لٹ گئے یا وہیں پڑاؤ
ڈال کر اپنا اسبابِ تجارت برباد ہوتے دیکھتے رہے۔ باہر کا، یا مقامی، کوئی بھی تاجر اس تانبے کے
بدلے میں اپنا چاندی سا مال دینے کو تیار نہ تھا۔ مال کے بدلے مال کے جو سودے ہو سکتے تھے وہ
ہوے باقی بازار جہاں کے تہاں رک گئے۔ منڈیوں میں ہاہاکار مچ گئی۔ گنتی کے جعل سازوں،
ساہوکاروں نے اس آپادھاپی میں مال بنایا، باقی برباد ہو گئے۔

آخر کو یہ نئے سکے واپس لینا پڑے۔ مہینوں تک سڑکوں کے کنارے تانبے کے ان ترک کیے
ہوے سکوں کے ڈھیر ٹیلوں ٹبوں کی شکل بنائے پڑے رہے۔

اور اس وقت سلطان محمد تغلق کو یہ غصہ تھا کہ رعایا نے حکم عدولی کی ہے۔ اس کے جاری کیے
سکوں کو بے توقیر کیا ہے۔ وہ گردن مارنے لائق ہیں۔ بیشتر سلاطین کی طرح یہ سلطان بھی نافرمانی،
سرکشی، حکم عدولی اور بغاوت، سب کی سزا دینا جانتا تھا۔

ممالکِ پنجاب، مالوہ، دکن، کورومنڈل، گجرات، بنگالہ جہاں جہاں شورشوں نے سر اٹھایا،
مملکت کی پوری طاقت استعمال کی گئی۔ ہزاروں کو کاٹ کے ڈال دیا گیا۔ لوگوں نے کہا، یہ خونی سلطان
ہے معافی اور درگزر سے آشنا نہیں۔

پھر بھی بادشاہ فیروز شاہ نے رعایا سے اس آدمی کے لیے معافی کی درخواست کرنے کا سوچا
تھا۔ چہ خوب!

یہ تو ایسا حکمراں تھا جس نے ایک روز بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا تھا کہ ملکِ چین پر فوج کشی ہونی چاہیے، کس لیے کہ دولت اور علم و حکمت و دانش میں چین کا ہم پلہ کوئی اور ملک نہیں۔ تو اس نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی سرکردگی میں ایک لاکھ چنیدہ سواروں کا لشکر یورش کے لیے چین روانہ کیا۔ ترائی تک پہنچتے پہنچتے سالاروں کو اندازہ ہو گیا کہ پہاڑوں میں گھوڑے اور گھڑ سوار بے کار ہوں گے۔ چارہ، گھاس اور موسم کی سختی سے پناہ... کچھ بھی مہیا نہ تھی۔

مورّخ فرشتہ لکھتا ہے کہ ہماچل کو سر کر کے بہت تھوڑے لوگ چین کی سرحد تک جا پائے، جہاں قلعہ بندیاں دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ تھوڑے ہی وقت میں مہم ناکام ہو گئی۔ واپسی آسان نہ تھی۔ ایک لاکھ سواروں کا یہ عظیم جیش پہاڑوں میں بھٹکتا، فاقوں اور بارشوں اور سیلابوں سے... اور وبا اور رہزنی کے ہاتھوں آہستہ رو موت کا شکار ہو گیا۔ گنتی کے لشکر والے واپس راجدھانی پہنچنے میں کامیاب ہو سکے جنھیں مفرور لشکری قرار دے کر موت کی سزا دی گئی۔ تاکہ عام شہری اور لشکری عبرت پکڑیں۔

یہ تھا محمد تغلق جس کے لیے سلطان فیروز شاہ نے بالآخر بیس برس بعد معافی نامے حاصل کیے اور اُس کے مرقد کے نزدیک سنبھال کے رکھوا دیے۔

کیونکہ لوگ سادہ اور مجبور ہوتے ہیں ــ اتنے سادہ اور مجبور کہ جابروں کو اور غلط کار حاکموں کو معاف کر دیتے ہیں ــ نقرئی سکوں کے عوض بھی اور اپنے دلوں کی سادگی میں بھی۔

لیکن اٹھارہ انیس برس کی ایک لڑکی نے کچھ معاف نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ اور اپنے لوگوں کے ساتھ کیے گئے ظلم پر وہاں فریاد لے کر آئی تھی کہ جہاں بے اختیاروں کے انبوہِ کثیر سے ــ ایک جابر و با اختیار کے لیے، اس کے مرے پیچھے، معافیاں خریدی جا رہی تھیں۔

بے شک آدمی کے اختیار میں اتنا تو ہے کہ وہ معاف نہ کرے اور یاد رکھے۔

قید خانے میں دوپہر سے شام ہو گئی۔

شاید مغرب سے کچھ دیر پہلے ایک فربہ اندام حبشن چٹائی کی ٹوکری میں دو روٹیاں اور مٹی کے

بدھنے جیسے ظرف میں دال لے کے آ گئی۔ کچھ کہے بغیر، صنوبر کی طرف دیکھے بنا عورت نے اس کے سامنے کھانے کی چیزیں رکھ دیں اور چلی گئی۔

تنگ و تاریک قید خانے میں، جہاں بالشت بھر چوڑا ایک روشندان چھت سے ملا ہوا بنا تھا، دن اور رات کا حساب کرنا مشکل تھا۔ تاہم عورت کے جانے کے بعد صنوبر کو کہیں دور سے مغرب کی اذان سنائی دی تھی جس سے اسے وقت کا اندازہ ہوا تھا۔

اس نے دیوار پر ہاتھ مار کر تیمم کیا اور مغرب کے فرض پڑھ کر روٹی کی ٹوکری کی طرف متوجہ ہوئی۔ دال روٹی غنیمت تھی اور گرم بھی۔ صنوبر نے شکر کیا اور پیٹ بھر لیا۔

پہاڑ سی رات سامنے تھی۔ فجر کے وقت اپنے ٹھکانے سے چلی ہوئی اس لڑکی نے بہت ہنگامہ خیز اور تیز رفتار دن گزارا تھا۔ رات کی آہستہ گزرنے والی ساعتوں کا سوچ کر لڑکی ایک بار لرز گئی۔

ویسے بھی اس کے لیے رات کاٹنا دوبھر ہوتا تھا۔ وہ تنہا ہو یا ہمسائی عورتوں، لڑکیوں کے ساتھ، گھر میں ہو کہ سفر میں، رات کاٹنا اس کے لیے پہاڑ کاٹنے جیسا تھا۔

بابا، ماں، بھائی، بہن، جنھیں اس نے دیکھا تھا، ہم جولیاں، یہاں تک کہ خادماؤں کے چہرے بھی آنکھوں کے آگے پھر جاتے، ان کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ بابا کو وہ دعائیں دیتے، آیتیں پڑھتے، تسبیح کرتے اور... ہمت بندھاتے دیکھتی اور سنتی۔ ماں کو وہ ہمیشہ سرگوشیاں کرتے، بڑے دکھ کے ساتھ التجائیں کرتی سنتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ صنوبر کی پیٹھ سہلاتے، سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے... چھوٹے چھوٹے فقروں میں کہتیں کہ ہم نے تیرا کوئی فرض ادا نہیں کیا اور اب خاتمہ سامنے ہے۔ بیٹا! معاف کر دے۔

اسے اپنی چھوٹی بہنوں کے کمھلائے ہوئے اُجلے اُجلے چہروں پر زبردستی کی مسکراہٹ دکھائی دیتی، جیسے وہ راضی بہ رضا ہوں کہ جو ہونے والا ہے، ہو کے رہے گا... پھر شکایت کس بات کی۔ کنبے قبیلے کے اور پڑوس کے بچوں کو وہ بھوک اور خوف سے روتے ہوئے دیکھتی۔ ماماؤں، خادماؤں کی آوازیں لشکریوں اور شاہی کارندوں کو، بادشاہوں کو کوستی یا بے مہر آسمان کا شکوہ کرتی سنائی دیتیں۔

اور وہ خردمند مرزا سخت کوش سپاہی زادہ... وہ بابا کے کسی دوست کا بیٹا تھا۔ ان پٹے ہوئے

لوگوں کا باہمت دوست تھا وہ۔ صنوبر اس کا چہرہ بھی ہر رات دیکھتی تھی۔ چٹان کی طرح مضبوط اور موم کی طرح نرم۔ آئینہ سا چہرہ جو سب چہروں کے ساتھ ہی گرد ہو گیا۔

اس کے اپنے لوگوں کے اٹھارہ چہرے، اٹھارہ پرچھائیاں اور کتنی ہی آوازیں۔ چمکارتی، مٹھارتی، چاہتوں کا اظہار کرتی، حوصلہ دلاتی اور ناامیدی میں سسکتی ہوئی۔

ایک بادشاہ اگر ان کی زندگیوں میں بے وجہ دخل نہ دیتا تو آج یہ سب ہی جیتے ہوتے۔ محرومی اور بھوک اور افلاس اور بیماری اور موت کا شکار نہ ہوجاتے۔

مغرب کے بعد جیسے اچانک آدھی رات ہوگئی، کوٹھری میں ایکدم اندھیرا پھیل گیا، ساتھ ہی مچھروں اور دوسرے کیڑوں کی یلغار ہوئی۔ لڑکی نے خود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹ لیا۔ مچھروں کی گردش کرتی آوازوں اور کونوں کھدروں میں کنمناتی جانداروں کی آہٹیں اسے آرام سے کب رہنے دیں گی، 'یہ چوہے ہوں گے' اس نے سوچا، 'روٹی کی خوشبو پا کر اپنے بلوں سے نکل آئے ہیں۔'

سب لڑکیوں کی طرح صنوبر کو چوہوں سے ڈر لگتا اور گھن آتی تھی۔ مگر اس وقت اندھیرے اور تنہائی میں ان جانداروں کی موجودگی اسے اچھی لگی، کوئی تو ہے جو کال کوٹھری میں اس کے ساتھ ہے۔

ابھی کہیں کھٹکا ہوا تھا۔ کہیں کوئی اور بھی ہے۔ کوٹھری کے تنگ دروازے کے پار اسے کمزور زرد روشنی کی ایک لکیر بھی نظر آئی۔ کوئی آرہا تھا۔ انھی لوگوں میں سے کوئی ہوگا۔

دروازہ کھلا اور چراغ اٹھائے وہی جشن کوٹھری میں آگئی۔ اس نے صنوبر کے آگے فرش پر چراغ رکھ دیا۔ وہ ایک سفید ریشمی کپڑے سے چراغ کا کنڈا پکڑے آئی تھی۔ چراغ رکھنے کے ساتھ ہی جشن نے وہ کپڑا فرش پر ڈال دیا تھا۔

صنوبر کو شک سا ہوا۔ یوں لگا جیسے عورت نے اسے دکھا کر کپڑا فرش پہ چھوڑا ہے۔ مگر اس نے سوچا، 'میرا وہم ہوگا۔ اگر یہ عورت رومال میرے استعمال کو لائی تھی تو اس نے مجھے دیا کیوں نہیں؟'

عورت، لڑکی کی طرف پشت کیے اب روٹی کی ٹوکری اور دال کا برتن اٹھا رہی تھی۔ لڑکی نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا، کپڑے کو چھو کر دیکھا، کپڑا اعلیٰ قسم کا تھا۔ اس نے اُسے پلٹا، ایک تہہ کھول

دی۔ کپڑے پر سیاہ چھپائی میں کوئی نقش بنا تھا، 'اچھا یہ رومالوں کی آرائش کا ایک انداز ہے جو ان دنوں پسند کیا جا رہا ہے۔' لڑکی نے سوچا۔ نقش؟ نہیں کپڑے پر گہرے نیلے یا سیاہ رنگ سے کچھ لکھا تھا۔ لڑکی نے دیکھا، عورت اس طرف پشت کیے اپنی مصروفیت میں تھی۔ لڑکی نے رومال کی سب تہیں کھول دیں۔ مدھم روشنی میں اس نے پڑھا، لکھا تھا، ''شرمندہ ہوں۔ تاہم آپ سے بے خبر نہیں رہا۔ یہ آنکھیں برابر آپ کو دیکھتی ہیں۔ یہ بے مصرف ہاتھ جلد ہی دیواروں میں روزن بنا دیں گے۔ بس ایک درخواست ہے... بھروسا رکھیے... اور کسی بات پر حیرت ظاہر نہ کیجیے۔''

بہت جما ہوا خط تھا اور عبارت اس طرح لکھی گئی تھی جیسے فارسی زبان میں شعر لکھے جاتے ہیں، 'اچھا تو یہ وہی سیاہ چادر والا ہے جو عسکریوں کو آتا دیکھ کر بھیڑ میں گم ہو گیا تھا۔'

جشن کو کسی ان جانے ذریعے سے خبر ہو گئی تھی کہ قیدی لڑکی کپڑے پر لکھا پیغام پڑھ چکی ہے۔ وہ مڑی اور صنوبر کی طرف دیکھے بنا، کپڑے سے چراغ کا کنڈا پکڑ، برتن ٹوکری اٹھائے کال کوٹھری سے نکل گئی۔

'یعنی کسی کو تو خبر ہے کہ میں یہاں ہوں۔ کوئی تو واقفِ حال ہے۔' اس نے سوچا، 'لیکن جس کے سب لوگ مر چکے ہوں، بے نام اجنبیوں نے اگر اس کا حال پوچھ لیا، تسلی دے لی تو کون سا فرق پڑ گیا۔ ویسے بھی راہ چلتوں کا حال آدمی پوچھ لیتا ہے۔ پر اس سے ہوتا کیا ہے۔'

تاہم کسی کے پرسانِ حال ہونے سے کچھ دُکھ بٹ گیا تھا۔ سخت سردی، تنہائی، تاریکی اور مچھروں کے باوجود صنوبر جاہ عشا کی نماز پڑھ کر کچھ دیر کو پیال کے تنگ بستر پر سوئی پھر اٹھ بیٹھی، ناہموار فرش پر تکلیف کے ساتھ ٹہلتی رہی، پھر سو گئی۔

یہ لڑکی، صنوبر جاہ، جب سے دربدر ہوئی تھی، بھوک، موسموں کی سختی، ناکافی نیند اور ہر وقت کی تھکن کی جیسے عادی ہو گئی تھی۔

پیال کے اس تنگ بستر پر فجر سے کیا معلوم کتنی دیر پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنی اونی چادر میں لپٹی کانپ رہی تھی۔ کسی اور کے لیے یہ سردی عذابناک ہوتی، صنوبر نے اسے برداشت کر لیا۔ کہیں سے فجر کی اذان سنائی دی تو وہ پھر اٹھی اور دیوار کا سہارا لیے کوٹھری میں گردش کرنے لگی۔ کچھ

ہی دیر بعد چراغ اٹھائے حبشن آ گئی اور اسے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی دروازہ کھلا چھوڑ کر چل پڑی۔
صنوبر پیچھے ہولی۔

کوٹھری سے نکل کر پتھر کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی وہ دونوں ایک بند دالان میں پہنچیں تو لڑکی کو اندازہ ہوا کہ اس نے یہ رات جس کوٹھری میں گزاری تھی وہ تو ماں کی گود کی طرح پرآسائش تھی۔ یہاں دالان کے کھلے حصے سے بے روک ٹوک برفیلی ہوا کی ایک لہر یوں چلی آ رہی تھی جیسے ان دیکھی برف کا ایک دریا بہہ رہا ہو۔ صنوبر کی اونی چادر اس سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ حبشن کے پیچھے پیچھے دالان کی لمبائی میں چلتے ہوئے اس نے قدم تیز کر دیے۔ غیر محسوس طور پر حبشن نے بھی قدم بڑھائے تھے۔ خدا خدا کر کے دالان ختم ہوا۔

دالان کے خاتمے پر صنوبر نے الاؤ جلتا دیکھا۔ یہ جگہ ہوا کی زد سے بچی ہوئی تھی۔ الاؤ کے پاس اس نے دیکھا کہ ایک آفتابہ اور سلفچی رکھی تھی۔ آفتابے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ 'خوب!' صنوبر نے سوچا، 'قید کرنے والوں نے وضو کے لیے گرم پانی بھیجا ہے۔' اس نے قریب ہی تپائی پر چادریں اور کپڑے تہہ کیے ہوئے رکھے دیکھے۔

حبشن کے اشارے پر اس نے وضو کیا، 'جو بھی ہو، یہ عورت ہمدرد لگتی ہے۔' اس نے صنوبر کو وضو کرانے کے بعد تپائی پر پڑی چادروں میں سے ایک فرش پر بچھا دی تھی، دوسری صنوبر کو دے کر اشارہ کیا تھا کہ اسے وہ اپنی چادر پر اوڑھ لے۔

ہوا کی زد سے بچ کر الاؤ کے پاس موجود رہنا ایک ایسی آسائش تھی جو لڑکی کو بہت دنوں بعد نصیب ہوئی تھی۔

وہ نماز پڑھ چکی تو حبشن نے چراغ بجھا دیا۔ اشارے سے بتایا کہ ابھی اسے تپائی پہ رکھے کپڑے بھی پہننا ہیں۔ عورت خود دیوار کی اوٹ میں چلی گئی۔

صنوبر کو لباس کی تبدیلی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ تاہم اس نے عورت کے بتائے ہوئے کپڑے پہن لیے۔ وہ حیران تو بہت ہوئی تھی مگر اس سے کہا گیا تھا کہ کسی بات پر حیرت ظاہر نہ کرے۔ اسے پہننے کو جو لباس دیا گیا تھا ایسا لباس ملکِ فارس کی عورتیں پہنتی تھیں... خاص طور پر آتش پرستوں کی

بیبیاں اور مائیں بہنیں بیٹیاں۔

بند دالان سے چلی تو صنوبر نے حبشن کے پیچھے ایک چھوٹا صحن پار کیا۔ وہ دونوں اب عمارتوں کے نسبتاً آباد حصے میں پہنچ گئی تھیں۔ دونوں ایک ایسے کمرے میں آ گئیں جہاں چوکی کے پاس لوہے کی ایک بڑی انگیٹھی میں آگ روشن تھی۔ حبشن اسے بٹھا کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹی تو تانبے کے قلعی دار برتن میں گرم شوربہ، ایک طشتری میں ترکی نان اور دو تازہ سیب لائی تھی۔ اس نے لڑکی کو ناشتا کرایا۔

صنوبر ان رعایتوں... یا مہربانیوں کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ ذہن میں یوں ہی سا ایک خیال پیدا ہوا اور محو ہو گیا کہ یہاں شاید سیاہ چادر والے اجنبی کا اثر و رسوخ کام دکھا رہا ہے۔

ناشتے کے برتن ہٹا کر جیسے ہی وہ عورت کمرے سے باہر نکلی ویسے ہی فرش پر بھاری جوتوں سے شور کرتے بہت سے نیزہ بردار لشکری کمرے میں گھس آئے۔ اتنے بہت سے لوگوں کی آمد سے کمرہ بھر سا گیا۔

لڑکی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ لشکریوں، اہلکاروں کے ہجوم میں رستہ بناتے دو آدمی تیز تیز چلتے ہوئے اس کی طرف آئے۔ ان میں ایک، اپنے لباس اور دستار کے جیغے سے، دیوانِ انصاف، محکمۂ قضاۃ سے متعلق لگتا تھا اور دوسرا... وہی بلند قامت اجنبی تھا۔ وہ اسی طرح سیاہ اونی چادر میں لپٹا ہوا، اپنا آدھے سے زیادہ چہرہ چھپائے تھا۔ صنوبر جاہ کو شک سا ہوا کہ اجنبی اسے دیکھ کر مسکرایا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ مسکرا رہا ہے۔

صنوبر جاہ کھڑی ہو گئی۔ وہ دیوار سے پیٹھ لگائے اس طرح کھڑی تھی کہ محکمۂ قضاۃ کا دستار والا اور وہ اجنبی عین اس کے سامنے تھے اور مسلح لشکری اور عمال اسے تین سمتوں سے گھیرے ہوئے تھے۔

اہلکاروں نے محکمۂ قضاۃ کے آدمی کو پارچوں میں لپٹے کاغذ دکھائے۔ اس دوران وہ دبی آوازوں میں کچھ عرض معروض کرتے رہے۔ قاضی، یا وہ جو بھی تھا، سنتا اور سر ہلاتا رہا۔ اس وقت نہ بولا، لڑکی کو بس گھورتا رہا۔

پھر اچانک اس نے صنوبر کی طرف دیکھ کر کہا، ''بانو مہریار! تم اس شخص کو پہچانتی ہو؟'' اس کا اشارہ سیاہ پوش اجنبی کی طرف تھا۔

صنوبر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے باری باری قاضی اور اجنبی کو دیکھا قاضی نے پھر سوال دُہرایا۔ اس نے صنوبر کو اس بار بھی بانو مہریار کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

لڑکی پریشان ہو کر کچھ کہنے ہی کو تھی کہ اجنبی نے اپنی گہری گونج دار آواز میں کہا، ''حضورِ والا! یہ بانو مہریار میری بیوی ہے۔ میں تو ہمیشہ سے اسے پہچانتا ہوں کس لیے کہ خاوند ہوں اس کا۔ فارس کے معزز تجارت پیشہ گھرانے سے ہمارا تعلق ہے اور ہم بہ اعتبارِ مذہب جناب زرتشت عالی مقام کے ماننے والوں میں سے ہیں۔ جیسا کہ حضورِ والا کے علم میں ہے اس شہر میں ہم اجنبی ہیں۔''

قاضی بیزاری سے بڑبڑایا، ''ہوں ہوں... شہر میں تو سبھی اجنبی...''

سیاہ پوش بے رُکے بولے جا رہا تھا، ''ہم اسبابِ تجارت لے کر پچھلے روز ہی شہر میں وارد ہوئے تھے۔ بانو اپنی خادماؤں کے ساتھ باہر نکلیں... رستہ بھول کر دارالشوریٰ میں جا پہنچیں جہاں وہ تماشا ہو رہا تھا۔ یہ دیکھنے کو ٹھہر گئیں اور ہجوم میں خادماؤں سے...''

''تماشے'' کے لفظ پر قاضی نے کڑوا منہ بنایا اور بے چینی کا اشارہ کیا، ''تاجر یزدیار! لمبی بات کیوں کرتے ہو؟... اب، جبکہ تم نے خاتون کی شناخت کر لی ہے تو اجازت ہے، اسے تم ساتھ لے جا سکتے ہو۔'' اور قاضی نے کاغذ پر کچھ لکھ کر اہلکار کے حوالے کیا۔ جس نے دستخط کر، انگشتری کی چھاپ لگا یہ کاغذ سیاہ پوش کو تھما دیا۔ بس یہ قاضی نے اہلکار کو آنکھوں سے کچھ اشارہ سا کیا ہو گا تو اہلکار نے اجنبی سے سرگوشی کی جسے تاجر یزدیار کہہ کر بلایا گیا تھا، اس نے چادر کی اوٹ سے مخمل کی ایک تھیلی نکالی، جو یقیناً سکوں سے وزنی ہو رہی تھی۔ اس نے تھیلی اہلکار کی طرف اچھال دی، کہنے لگا، ''پہلی بار اس شہر میں آیا ہوں، دوستوں کے لیے مناسب تحفے نہ لا سکا۔ آپ اور یہ لشکری دوست کچھ خیال نہ کیجیے گا... یہ آپ کی نذر ہے۔''

اہلکاروں لشکریوں نے خوش ہو کے ایک دوسرے کو دیکھا، قاضی اس عرصے میں کمرے سے جا چکا تھا۔

جس طرح پُرشور انداز میں فرش پر پیر مارتے اور نیزوں کی لکڑیاں کھٹکھٹاتے وہ لوگ کمرے میں گھسے تھے، اسی طرح وہ کمرہ خالی کر گئے۔

اب وہاں تاجر یزدیار اور صنوبر رہ گئے۔ تاجر نے چادر کا گوشہ چہرے سے ہٹا دیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے سیاہ چادر اتار کے اپنے بازو پر ڈال لی۔ لڑکی نے دیکھا کہ وہ فارس کے شرفا کا لباس پہنے ہے اور پٹکے میں لگے ایک چھوٹے خنجر کے سوا کوئی ہتھیار اس کے پاس نہیں۔

کسرتی بدن کے اس بلند قامت نوجوان کی مونچھیں تاتاریوں کی طرح نیچے کو جھکائی ہوئی مگر مختصر تھیں۔ اس کی آنکھیں، جیسا کہ لڑکی کو یاد تھا، اجلی سبز تھیں اور شانوں تک پہنچتے ہوئے گھنے بالوں کا رنگ سرخی مائل سیاہ تھا۔ چہرے کی گندم گوں رنگت سے لگتا تھا کہ محل سراؤں کی بجائے وہ اپنا زیادہ وقت کھلے آسمان کے نیچے گزارنے کا عادی ہے تو دھوپ نے اور بارشوں نے اور بیابانوں کی ہوا نے چہرے پر اپنے نقش چھوڑ دیے تھے جس سے اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ ہوا تھا۔

صنوبر نے آہستہ سے کہا، ''شکرگزار ہوں آغا! مگر میں سمجھی نہیں یہ کیا قصہ ہے... بانو مہریار کون ہے؟''

''بانو مہریار کسی تاجر یزدیار نامی کی بیوی ہو گی... اس لیے کہ یہاں کاغذ پر یہی لکھا ہے۔'' وہ ہلکے سے ہنسا، ''لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں یہ بندی خانہ ابھی چھوڑ دینا چاہیے... آپ سواری کر سکتی ہیں؟''

''ہاں، مگر ہم جائیں گے کہاں؟ دِلی میں یا دولت آباد میں، یا کہیں بھی، میرا اپنا کوئی نہیں ہے۔''

وہ ہنسا، کہنے لگا، ''راجدھانیوں میں تو خاص طور پر کسی کا اپنا کوئی نہیں ہوتا۔'' پھر بولا، ''ہم دور جائیں گے... کہیں ایک شہر، خوش آب نام کا ہے... وہاں ہمیں عافیت ملے گی، میرے کچھ دوست ہیں وہاں۔''

تو وہ تیز رفتار مرکبوں پر شہرِ خوش آب کی طرف چل پڑے۔ راہ میں لڑکی صنوبر جاہ نے نوجوان کو اپنے بارے میں جو بتایا وہ اس طرح تھا:

اس نے بتایا کہ وہ قنوج کے عالم مولائی خیرالدین مرزا کی بیٹی ہے۔ وہاں اس کے بابا کی کچھ زمین اور ایک باغ تھا۔ اس وقت تک انھوں نے گھر نہیں بسایا تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ ایک بار سرکشوں کا کھیدا کرتے ہوئے سلطان محمد تغلق قنوج تک آیا، باغیوں کی گرفت کی۔ ان کے سر حصار کے کنگرے پر لٹکائے، پھر اپنے جنون میں رعیت پر بے وجہ ستم ڈھاتا، بے گناہوں کا خون بہاتا قنوج سے مہوبے تک کا اپنا علاقہ خود تاراج کرتا دارالخلافے لوٹ گیا۔

قنوج میں کچھ نہیں بچا تھا جس کے لیے خیرالدین مرزا وہاں رکتے... تو وہ دِلّی آ بسے۔ یہاں شادی کی، گھر بنایا۔ عافیت کے دن گزارتے تھے کہ دِلّی والوں کو کوچ کا حکم ملا۔ نئی راجدھانی بسائی جا رہی تھی۔ کوئی کیا کرسکتا تھا۔ خیرالدین نے اپنے بیوی بچوں کو لے کر نقل مکانی کی (افسوس! ان بہن بھائیوں کو صنوبر کبھی نہ دیکھ سکی)۔ دو برس دربدری کا عذاب جھیلا۔ اس دوران ان کے گھر کے چھوٹے بڑے گیارہ آدمی مر چکے تھے۔ جو بچے تھے دِلّی واپس آ گئے جہاں صنوبر پیدا ہوئی۔ کچھ برس دِلّی میں رہے پھر بداؤں جا بسے۔ وہاں سسرالی رشتے داروں نے خیرالدین کا ساتھ دیا تو انھوں نے تھوڑی زمین حاصل کرلی۔ باغ لگائے جن کی آمدن سے کنبہ آسودہ حال ہوا۔

صنوبر اب سمجھ دار تھی۔ ماں باپ اس کی طرف سے فکرمند بھی تھے۔ لیکن پے در پے خشک سالی نے اور دوسرے تغلق بادشاہ نے، اس کے محاصل وصولنے والوں نے، رحم نہ کیا اور ذرا بھی مروت رعایت نہ کی۔ گھر ایک بار... آخری بار مٹ گیا۔ مفلسی میں خیرالدین مرزا اور ان کی بی بی گزر گئے۔

ایک تغلق بادشاہ کے جنون کی لپیٹ میں اس کے گھر کے اتنے لوگ آ گئے تھے، دوسرے بادشاہ کے محاصل اور مطالبات نے اور قحطِ آب نے ترکے میں آئی ہوئی اس کی زمین مٹی کردی۔

''گھر میرا افلاس میں اور دربدری میں ختم ہوگیا۔'' وہ اداسی سے مسکرائی، کہنے لگی، ''لیکن آپ واقف ہوں گے، میں اکیلی اس ابتلا سے نہیں گزری ہوں... ہزاروں ہزار لوگ گزرے ہیں۔''

لڑکی کا وہ محسن اسے تسلی دینے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

خیر، تو وہ لوگ منزلیں مارتے شہرِ خوش آب پہنچ گئے۔ جہاں انھیں ان کے نصیب کی خوشیاں بھی ملیں۔

... اور یہاں یہ کہانی ختم ہوتی ہے۔

تاہم تھوڑا کچھ ابھی کہنے سے رہ گیا ہے جسے یہاں درج کردینا ضروری ہے:

ایک روایت یہ ہے کہ سیاہ پوش جوان، جس نے شہرِ خوشاب پہنچ کر صنوبر جاہ سے اپنا گھر آباد کیا، فی الاصل فیروز شاہ تغلق کا بڑا بیٹا فتح خان تھا جو زیرِ عتاب تھا اور اپنی ماں سے ملنے چوری چھپے دارالخلافہ دِلّی آیا ہوا تھا۔ اس کے باپ سلطان فیروز شاہ نے مہینوں پہلے ایک معقول لشکر دے کر

شورش رفع کرنے اسے پنجاب روانہ کیا تھا۔ خوشاب کے راستے میں، جبکہ ابھی کوئی معرکہ پیش نہیں آیا تھا، فتح خان نے مسلسل تین راتوں تک ایک ہی خواب دیکھا کہ وہ (معاذ اللہ) اپنی تلوار سے کتاب اللہ کے اوراق پارہ پارہ کررہا ہے۔ اس نے ہر بار توبہ استغفار کی مگر دل کا ہول رفع نہ ہوا۔ چوتھے دن اس نے سالاروں کو اکٹھا کیا اور اپنے والد سلطانِ ممالک کا عطا کیا ہوا پرچم اور تلوار ان کے حوالے کر دی، کہا کہ میں سپہ گری سے، جدال اور قتال سے ہاتھ اٹھاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے لشکر گاہ چھوڑ دی اور خوش اوقات بنجاروں، ہنرمندوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہر میں داخل ہو کر خود کو عامیوں، دستکاروں کے قبیلوں میں گم کردیا۔

چند ہی روز میں خبر ملی کہ انتظامات کا جائزہ لینے سلطانِ ممالک دِلّی سے جانے والا ہے، تو فتح خان ماں سے ایک بار ملنے روانہ ہوگیا۔ اور راجدھانی میں اس کے اور لڑکی صنوبر جاہ کے ساتھ وہ سب واقعات پیش آئے جو اوپر بیان کردیے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ بعد میں فیروز شاہ کے مخبروں نے اسے خبر دی تھی کہ فتح خان خوشاب میں اپنی اہلیہ کے ساتھ عامیوں کی طرح رہتا ہے تو سلطان نے بیٹے اور بہو کی تقصیریں معاف کرتے ہوئے انھیں دربار میں طلب کیا تھا۔ شاہی مکتوب پا کر فتح خان اپنی بیوی کو لے مفقود الخبر ہوگیا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں اس دارالخلافے میں قدم رکھیں جہاں صنوبر جاہ کے لیے رنج والم کے کتنے ہی نشان بکھرے پڑے تھے۔

وقائع نگار صنوبر جاہ نامی کسی بھی عورت کے بارے میں خاموش ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ فتح خان کو دِلّی کے شہرِ خموشاں کے ''خطیرے'' میں دفن کیا گیا تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بادشاہ عالمگیر کے زمانے تک خوشاب میں صنوبر کی بارہ دری موجود تھی۔

فیروز شاہ کی زندگی میں جب اس کا پوتا نوجوان غیاث الدین تغلق شاہ تخت پر بیٹھا تو اپنے ماں باپ کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے وہ خوشاب آیا تھا اور یہاں کچھ دن ٹھہرا تھا۔ نوجوان غیاث الدین تغلق شاہ نے، جسے اس کے ماں باپ خوش بخت خان کہہ کر بلاتے تھے، اس شہرِ خوشاب میں عمر کے ابتدائی آٹھ برس گزارے تھے پھر کیونکہ رہائش گاہ میں اچانک آگ بھڑکنے سے ماں باپ دونوں ہلاک ہو گئے

تھے اور نو عمر خوش بخت کا والی اس کے دادا سلطانِ ممالک فیروز شاہ تغلق کے سوا کوئی اور نہ تھا اس لیے شاہی عمال اس بچے کو دارالخلافہ دِلّی لے آئے جہاں اس کی تربیت ہوئی اور وہ اپنے دادا سلطانِ ممالک فیروز شاہ کی زندگی ہی میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک سادہ سی کارروائی میں فیروز شاہ نے اپنے بیٹے اور بہو کو نافرمانی کی سزا بھی دے لی تھی اور اپنے ہونے والے جانشین خوش بخت خان غیاث الدین تغلق کو بھی بے نوا دست کاروں کے محلے سے نکال دارالخلافے بلوا لیا تھا۔ کیونکہ وقت آنے پر اس خوش بخت کو تغلق سلطانوں کی مسند سنبھالنی تھی۔ واللہ اعلم۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔

تاہم صاحبانِ رایت واورنگ سے کچھ بعید بھی نہیں ہے، ہو سکتا ہے ایسا ہی کیا گیا ہو۔

جو بھی ہو، صنوبر اور فتح خان کی کہانی عامیوں میں کئی طرح سنائی جاتی ہے اور لوگوں کو خوب یاد ہے۔ کس لیے کہ مار کھائے ہوئے محروم لوگ، وہ دِلّی میں ہوں یا خوشاب میں... اور کہیں بھی کسی بھی عہد میں ہوں... جابر سلطانوں سے 'ناں' کہنے والوں کو اور ان کی کہانیوں کو بہت شوق سے یاد رکھتے ہیں۔

ماشٹر

ہر کہانی لکھنے والے کے پاس ادھ لکھی ادھوری کہانیاں ہوتی ہیں۔

میرے پاس بھی کئی ادھوری کہانیاں ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جن کا مجھے خیال رہتا ہے کہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہیں... کیا خبر اور بھی ہوں، لکی چھپی۔

بعض کہانیاں نوٹس کی صورت میں ہیں۔ کچھ نوٹس کئی صفحوں پر پھیلے ہیں، کچھ کم پر۔ بعضے تو بہت ہی مختصر ہیں، ایک ڈیڑھ سطر کے ہوں گے۔ ایک جگہ تو صرف پوائنٹس لکھے ہیں، 'کرائے دار'، 'بیسا کھی والا'، 'مرشد'، 'قتل'، 'ہووپ'۔

یہ ٹانگوں سے معذور، اپنے وقت کے مشہور جیب کترے اور نوسر باز 'بمبئی ماشٹر' کی کہانی کے نوٹس ہیں۔

ان میں 'ہووپ' کا لفظ انوکھا ہے۔ باقی 'قتل'، 'بیسا کھیاں'، 'کرائے دار' اور 'مرشد' یہ سب پہچانے ہوئے لفظ ہیں۔ 'ہووپ' ایک طرح کی آواز ہے۔

تو اب دیکھیے ان لفظوں کی مدد سے ماشٹر کو اور اس کی سنائی ہوئی سنسنی خیز کہانیوں کو یاد کرنے کا کچھ انتظام کرتا ہوں۔

بمبئی ماشٹر ہمارے پشتینی مکانوں میں سے ایک بہت چھوٹے مکان میں اپنی بیوی اور سات

آٹھ برس کی بیٹی کے ساتھ کرائے سے رہتا تھا۔ وہ ہم لڑکوں اور بعض ہمسایوں کا ایک دم 'ذاتی' داستان گو تھا۔ اسے کہانیاں سنانے کے ساتھ کہانیاں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔

وہ خود کو بلند آواز میں اسلامی تواریخی ناولیں اور بہرام ڈاکو کی کہانیاں پڑھ کے سنایا کرتا تھا۔ اور جب ناولیں اور کہانیاں نہیں پڑھ رہا ہوتا، اور ہم لوگ مناسب تعداد میں آس پاس موجود ہوتے، تو وہ اپنے معرکوں کے بارے میں بتاتا، کہ کس طرح اس نے ٹرام میں بیٹھے بیٹھے منٹ بھر میں ایک مارواڑی سیٹھ کی کیش کی تھیلی اڑالی تھی اور کس طرح اس نے اس پیسے سے گوا اور سری نگر اور اجمیر شریف میں مزے کیے تھے... اور کس طرح وہ ایک بار درگاہ حاجی علی جانے کے لیے اجتماعی گھوڑا گاڑی میں آگے کوچبان کے پاس جا بیٹھا تھا تو اس نے رستے سے سوار ہونے اور اتر جانے والے ایک سنار کی صندوقچی سے کوئی سیر بھر سونے کے زیورات اڑا لیے تھے... اس مہارت کے ساتھ کہ نہ سنار کو پتا چلا کہ زیورات جا چکے ہیں اور نہ کوچبان کو معلوم ہوا کہ ماشٹر اس کے وزنی فوجی بوٹ لالہ جی کی صندوقچی میں ڈال چکا ہے۔ اور اب جو لالہ جی کرائے کے دو آنے پکڑا کے سامان اٹھائے خوشی خوشی گھوڑا گاڑی سے اتر رہا ہے تو اصل میں وہ کوچبان کے بوٹ لیے جا رہا ہے، زیورات نہیں۔

ہمیں بہت لطف آتا تھا۔ بڑی کھلبلی ہوتی تھی کہ سنار جب اپنی دکان پہ پہنچے گا اور صندوقچی کا قفل کھولے گا تو اسے وہاں سیر بھر سونے کی بجائے کباڑی بازار سے بارہ آنے میں خریدے گئے فوجی بوٹ ملیں گے۔ مزہ آ جائے گا۔

بمبئ ماشٹر اپنی جیب کتری، چوری چکاری اور پھکیتی (اور شاید عورت بازی) کی کہانیاں سناتے ہوئے خود کو ایک عجیب منصف مزاج سوشلسٹ اور ایک انوکھے 'صاحبِ ایمان' مسلمان کی طرح پیش کرتا تھا۔ یہ خوب شوق تھا اس کا۔ اپنی کہانیوں میں وہ کسی غریب ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی مل مزدور، پھیری والے کی جیب نہیں کاٹتا تھا۔ اور کسی ملک التجار، ساہوکار، دھنی دھنوان کو — جو مسلمان ہو — ہرگز نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ اور اس کا شکار دولت مند ہندو ہوتے تھے اور وہ بھی ایسے جن کے بارے میں اسے معلوم ہوتا تھا کہ سالے 'سود بیاج' کھاتے ہیں۔ اس کے سوا ماشٹر دین دھرم کا بھید بھاؤ نہیں کرتا تھا۔ نہ!

ہم لڑکوں کی موجودگی میں بمبئ ماشٹر کو اپنی عورت بازی کے بیان سے سرسری سا گزرنا ہوتا تھا۔ تاہم سننے والے ہمسایوں کی آنکھوں کی چمک اور ماشٹر کے رمزیہ انداز میں سر ہلانے سے ہم سمجھ جاتے تھے کہ اس وقت جو بمبئ ماشٹر اس ہندو عورت کو 'سمجھا بجھا کے' اپنی کھولی میں لے جا رہا ہے تو بے شک اب یہ اس کے ساتھ سوئے گا۔

بمبئ میں زندگی کرنے کے دوران جو مسلمان عورتیں اور لڑکیاں ماشٹر کے راستے میں آتیں، ماشٹر انھیں ٹرام میں بٹھا کے صابو صدیق کی سرائے کے سامنے چھوڑ آتا تھا کہ "لے اماں"، (یا "لے بیٹی") یہ سامنے اپنے مسلمانوں کی سرائے ہے، جب تک کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا تو ادھر رہ سکتی ہے۔

میں ہمیشہ سے یقین کر لینے والا آدمی ہوں۔ ماشٹر کی باتیں (جیسی وہ بیان کر رہا ہوتا) اسی طرح مان لینے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ مگر مجھ سے ایک ڈیڑھ سال چھوٹا میرا بھائی ماشٹر کی اپنی بیان کردہ نیکیوں پر بالکل بھی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا... بلکہ یقین تھا اسے... کہ ماشٹر نے مسلمان حاجیوں تک کی جیبیں کاٹی ہوں گی اور موقع لگنے پر مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی وہی سب کیا ہوگا جو وہ ہندو عورتوں کے ساتھ کرتا رہا ہے۔

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ ماشٹر جھوٹ بولتا ہے، یا اس نے وہ کیا ہے جسے لوگ کرتے رہتے ہوں گے اور بتاتے نہیں، یا اپنی چوری چکاری بیان کرتے ہوئے وہ مسکرائے جاتا ہے... جیسے چوریاں نہ ہوئیں ساہوکاریاں ہو گئیں؛ جیسے اکھاڑوں میں کشتیاں جیتی ہوں ماشٹر نے۔

مجھے ان سب باتوں کی پروا نہیں تھی۔ میں تو اتنا جانتا تھا کہ ماشٹر کی کہانیاں مجھے الجھا لیتی تھیں۔ سال بھر پہلے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ یہاں آیا تھا اور ہم لڑکے کوئی آٹھ مہینے سے، کسی کو بتائے بغیر، چپکے سے جا کے اس کی کہانیاں سن لیتے تھے۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو معلوم تھا کہ گھر والوں سے ہمارے آنے کا ذکر بالکل نہیں کرنا ہے۔ کیونکہ گھر والوں کو یہ پسند نہیں تھا کہ ہم ماشٹر کے گھر آئیں جائیں یا اس کی کہانیاں سنیں یا محلے والوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں۔

ماشٹر بیڑی بناتا تھا۔ اس کی بیوی اجرت پہ گھر سنبھالنے والی 'موگلانی' تھی۔ یہ ماشٹر نے ہمیں بتایا تھا (گھر والے کہتے تھے وہ کہیں پیسے والوں کے وہاں کھانا پکاتی ہے)۔ تو کھانا پکانے میں کیا

ہے؟ اگر کسی 'موگلانی' نے پیسے والوں کا کھانا پکا دیا تو کیا ہو گیا؟ کسی کو تو پکانا ہوتا ہے کھانا (اور یہ پیسے والی بات ابھی ہمارے ذہن میں ٹھیک سے نہیں آئی تھی۔ یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ کچھ لوگوں کے پاس پیسے ہوتے ہیں کچھ کے پاس نہیں ہوتے یا کم ہوتے ہیں۔ تو اس سے کسی کو کیا؟)۔

گھر والوں کو یہ بھی کہتے سنا تھا کہ ماشٹر اور اس کی بیوی کچھ گھپلا کر رہے ہیں۔ کوشش کرنے پر بھی ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ کیا گھپلا کر رہے ہیں؟ یہ بھی سنا تھا کہ ہو سکتا ہے گھر والے ماشٹر کو یہاں سے چلتا کر دیں۔ میرے چھوٹے بھائی نے اپنے طور پر کچھ پتا کرنے کی کوشش کی تھی مگر کچھ بھی زیادہ صاف نہیں ہو پایا تھا۔ مطلب، اسے شک سا تھا کہ ماشٹر کی بیوی کے ساتھ 'دوسرے' لوگ سوتے ہیں۔ بکواس بات تھی! سوتے ہیں؟ ہاہ! کبھی ہو سکتا ہے بھلا؟ ماشٹر 'دوسرے' لوگوں کو چھری نہیں مار دے گا!

خیر، یہ ایسی باتیں تھیں کہ ان پر ہم لوگوں کو زیادہ کچھ غور کرنے کا شوق نہیں تھا (میرے چھوٹے بھائی کو تھا مگر اس کی بکواسوں پر اکثر میں اسے ڈانٹ دیتا تھا)۔

محلے میں ایک اچھے آدمی امومیاں رہتے تھے (ہم انھیں ٹیڑھی گردن والے امومیاں ہووپ کہتے تھے)۔ یہ لمبا، بے کار سا نام ہم ہی نے رکھا تھا۔ امومیاں پیری مریدی کرتے تھے۔ ان کی گردن ٹیڑھی تھی اور وہ بیٹھے بیٹھے ہووپ ہووپ کی آواز نکالتے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے اپنے موکل کو یا کسی جن کو بلا یا بھگا رہے ہیں۔ امومیاں نے بمبئی ماشٹر کو بھی مرید بنا لیا تھا۔

ماشٹر اکثر بڑے جذبے کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کے کہتا تھا، ''پیر امومیاں صاب نے بھٹکے ہوئے ماشٹر کو صئی رستے پہ لگا دیا ہے، نہیں تو ماشٹر جہنمی مارا گیا تھا۔''

پتا نہیں وہ خود کو جہنمی کس بات پہ کہتا تھا؟

باقی کہانی زیادہ کچھ لمبی نہیں ہے۔ ہم لوگ گرمیوں کی چھٹیوں میں تایا کے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ بیس دن بعد لوٹے تو دیکھا کہ ہمارے جس مکان میں ماشٹر رہتا تھا، اس میں اب گھاس کا بیوپاری رہتا ہے اور سامنے والے میاں (ٹیڑھی گردن والے امومیاں ہووپ) کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی تو ہمیں پروا نہیں تھی، ہاں، ماشٹر کے جانے سے ہم لوگ بے مزہ ہو گئے تھے کہ وہ سب

سننی والی کہانیاں اب سننے کو نہیں ملیں گی۔

دوسرے روز میرا چھوٹا بھائی عجیب کہانی لے کے آیا۔ بتانے لگا کہ ماشٹر اصل میں کہیں شفٹ نہیں ہوا ہے، جیل میں ہے۔ اس نے ٹیڑھی گردن والے امومیاں ہووپ کی گردن میں چھری ماری تھی اسی سے امومیاں مرے ہیں۔ بھائی بتانے لگا کہ پہلے پہل تو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ بعد میں دھوبیوں کے لڑکوں نے بتایا کہ رات میں کسی وقت ماشٹر کی بیوی جب امومیاں ہووپ کے لیے میٹھے چاول لے کے گئی تو امومیاں نے اس پہ برے ارادے سے ہاتھ ڈال دیا۔ وہ چیخنے لگی تو ماشٹر بیساکھیوں کے سہارے اچھلتا ہوا سڑک پار کر کے ہووپ کی بیٹھک میں پہنچا جہاں اس نے وہ سب دیکھا جو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ امومیاں نے کتنی بار ہووپ ہووپ کی مگر بیوی کی بات ٹھیک تھی تو بس ماشٹر نے ٹیڑھی گردن والے ہووپ کی گردن پہ چھریاں ہی چھریاں ماریں اور اسے ختم کر کے سڑک پہ آ کے بیٹھ گیا... اور رونے لگا۔ دھوبیوں کے لڑکے خود حیران ہو رہے تھے کہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ رو کیوں رہا تھا ماشٹر؟ اور امومیاں ہووپ کو اس نے چھریاں کائے کو ماری تھیں؟ لڑکے کہہ رہے تھے کہ ماشٹر خود ہی تو اپنی عورت کو چلاتا تھا، ایک امومیاں کے ہاتھ پکڑنے سے کون سا طوفان آ گیا تھا؟

چھوٹے بھائی نے بتایا کہ دھوبیوں کے لڑکے طُوفان کو طَوفان کہہ رہے تھے۔

جاہل سالے!

تصویر سے نکلا ہوا آدمی

میں نے، میرے دوست اور شونالی نے اس کہانی کو جس طرح کُھلتے اور پھیلتے دیکھا ہے، اس طرح کسی اور نے نہیں دیکھا ہوگا۔ ہم اس جیسی ہر کہانی کا خاتمہ بھی جان گئے ہیں۔ وہ ہم کسی کو نہیں بتانے والے۔

میں اور میرا دوست ایک مشکل چڑھائی چڑھ رہے تھے... تو ہم نے دیکھا کہ جس ڈھلان پر ہم تھے وہ اُترتے ہوئے اچانک ایک کھائی پر ختم ہو جاتی تھی۔ کھائی کی دیواریں گھنی جھاڑیوں، کائی چڑھی چٹانوں اور پہاڑی گھاس پھوس سے بنی ہوئی لگتی تھیں۔ دور یا قریب سے دیکھ کر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کھائی اصل میں کتنی گہری ہے۔

کوئی اس گہرے سبز پیالے کے دہانے سے نظر ڈالتا ہوگا تو اُسے اوپر کائی چڑھی چٹانوں کی قوس پر کھنچی ایک چہار دیواری دکھائی دیتی ہوگی۔ چہار دیواری گہری سرخ اینٹوں اور سلیٹی پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ دوسری طرف چمن بندی کی گئی ہوگی، اس لیے کہ جا بجا پھول دار بیلیں دیوار چڑھ کر اِدھر لٹک آئی تھیں۔ میں نے، اور دوست نے بھی، خوش ہو کے دیکھا اور جان لیا کہ اُدھر ایک آباد عمارت ہے، کیونکہ چہار دیواری کے پار کہیں کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ دور دور تک جلائے گئے پتوں کی خوشگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

دوست نے آہستہ سے کہا، ''چمن کی صفائی اور خشک پتے جلانا عافیت کے دنوں کا مشغلہ ہے۔

یہ کوئی پُرامن جگہ ہے۔ آؤ دیکھتے ہیں۔''

اپنا سامان اُٹھا کر، بہت چکر کے راستے سے، درختوں اور جھاڑیوں سے بھری اُس کھائی پر مُڑ مُڑ کر خوف کی نظر ڈالتے، ہم بالآخر وہاں پہنچ گئے جہاں چہار دیواری میں ایک کٹاؤ تھا اور کٹاؤ میں لوہے کا چھوٹا پھاٹک لگا تھا۔ ڈر ہمیں اس بات کا تھا کہ اگر ڈھلان پر سے ہم پھسلے تو کھائی کی تہہ تک، یا کہیں بھی پہنچنے سے پہلے اُن چٹانوں سے ٹکرا کر مارے جائیں گے۔

خیر، ہم اوپر پہنچ گئے جہاں ہم نے دیکھا کہ پھول دار ڈیزائنوں والے پھاٹک پر نیا نیا پینٹ کیا گیا تھا۔

دوست نے ہاتھ اندر پہنچایا اور پھاٹک کی سٹکنی اتار دی۔ ہم آہستگی سے احاطے میں داخل ہو گئے۔

سامنے ایک عمارت تھی؛ چیل کے درختوں اور سدا بہار جھاڑیوں میں، نگینے کی طرح جڑی ہوئی۔ کنٹری ہاؤس جیسی اس عمارت پر ابھی رنگ روغن ہوا ہوگا۔ سامنے کا لان بھی نفاست سے تراشا گیا تھا۔ کئی جگہ بے آباد تھالوں میں گھاس پھوس اور خشک پتے اکٹھا کر کے جلا دیے گئے تھے جن سے کاہلی کے ساتھ دھواں اُٹھ اُٹھ کر خوشبو پھیلا رہا تھا۔ یہی خوشبو تھی جس نے مجھے، میرے دوست کو متوجہ کیا تھا۔

میں نے گہرے گہرے سانس لے کر روشنی اور رنگوں سے کھلکھلاتے اس منظر کو اندر اُتار لینا چاہا تھا کہ چیل کے ایک ٹنڈ منڈ درخت کے پیچھے سے کسی نے کہا، ''سامان نیچے رکھ دو اور ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ میرے پاس شاٹ گن ہے۔'' آواز کسی لڑکی کی تھی اور بات نرمی سے کہی گئی تھی۔

اُس نے دوسری بار سختی سے کہا، ''چلو! ڈُو، ایز آئی سے!''

ہم دونوں نے تعمیل کی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ ویسے حکم دینے والی عورت یا لڑکی ابھی ہمیں نظر نہیں آئی تھی۔

پھر ہمیں وہ لڑکی یا عورت نظر آ گئی۔ گھڑ سواری کے خاکی 'جودھپورز' پر، پوری آستینوں والی گہرے سبز رنگ کی تنگ جرسی اور صدری جیسا روئی بھرا اونچا کوٹ چڑھائے گھڑ سواری کے جوتے پہنے، ڈھیر سارے بالوں کو سبز رنگ کے رومال سے قابو میں کیے، ایک عورت، جسے لڑکیوں میں شمار کیا

جا سکتا تھا، درخت کی اوٹ سے نکل کر شاٹ گن سیدھی کیے ہماری طرف بڑھی تھی۔

اس نے ڈپٹ کے پوچھا، ''کون ہو تم لوگ؟''

دوست نے مسکراتے ہوئے میری طرف سر سے اشارہ کیا، ''یہ یونیورسٹی کے انگریزی ادب کے شعبے میں ریڈر ہیں اور میں وہیں پروفیسر اور عارضی چیئرپرسن ہوں... کیونکہ اصل آدمی اوکسفرڈ چلا گیا ہے، دوسرا ابھی آیا نہیں۔''

عورت نے آہستہ سے کہا، جیسے خود کو سمجھا رہی ہو، ''باتیں، باتیں، باتیں!''

دوست کہنے لگا، ''پیشہ، میڈم! پیشہ۔ گیارہ برس سے تقریباً کند ذہن اور اونگھتے ہوئے طالب علموں کو اپنی آواز سے جگائے رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''کوئی ہتھیار ہے تم لوگوں کے پاس؟'' لہجے میں اب کھردرا پن نہیں تھا۔

دوست بولا، ''بس ایک کوڈک کیمرا اور دو تیز دھار والے ذہن ہیں... جی نہیں، ہم غیر مسلح ہیں۔ امن اور سلامتی میں نکلے ہیں۔''

ہلکی مسکراہٹ سے کہنے لگی، ''آپ دونوں اپنے ہاتھ گرا سکتے ہیں۔'' خود اس نے اپنی بندوق کی نال زمین کی طرف کر لی تھی۔

دوست چہکتے ہوئے بولا، ''صرف ہاتھ ہی نہیں، میڈم! ہم اپنے تھکے ہوئے وجودوں کو اس گھاس پر گرا کر دم تک دے سکتے ہیں۔ نو گھنٹے سے چائے، کافی کی صورت نہیں دیکھی۔''

میں نے کہا، ''مداخلت کی معافی چاہتے ہیں۔ دھویں کی خوشبو ہمیں کھینچ لائی تھی۔ اگر ایک پیالی...''

اب جو وہ بولی تو ایک متواضع میزبان تھی، ''جی ضرور ملے گی۔ اتفاق سے آپ صحیح جگہ آئے ہیں۔ چائے، کافی بنانا مجھے پسند ہے... بس دو منٹ یہیں ٹھہریے۔ میں اپنا چیتا باندھ آؤں۔''

ہم دونوں نے صاف سُنا، اس نے چیتا کہا تھا۔

دوست نے مسکراتے ہوئے پوچھا، ''چیتا؟ میڈم! آپ نے لفظ چیتا کہا ہے؟''

وہ ہنسی، ''جی۔ پالتو چیتا ہے۔ مادہ ہے۔ میں اسے 'کوئین اوف شیبا' کہتی ہوں۔''

دوست نے گھبرا کر پہلے مجھے دیکھا۔ گھاس پر سے اپنا جھولا اور پکنک باسکٹ اُٹھالی۔ آہستہ سے کہنے لگا، ''میڈم! یقین کیجیے، ہمیں آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ کسی اچھے موسم میں پھر ملاقات ہوگی۔'' پھر وہ میری طرف مڑا، ''چیتا ہے یہاں... زندہ رہے تو ایک نہیں ہزار پیالیاں مل جائیں گی۔ چلو!''

میں نے بھی سامان اُٹھا لیا اور اس حد درجہ خوبصورت، سانولی، بوٹا سی، تباہ کُن عورت سے کہا، ''دوست ٹھیک کہتا ہے۔ پھر کبھی... کسی اچھے موسم میں...'' اور ہم نے جنگل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

''رکو، رکو! تمھیں نہیں پتا میری 'کوئین' کہاں ہے۔ وہ بھی تمھارے بارے میں زیادہ نہیں جانتی... اور یہ خطرے کی بات ہے۔''

خاتون ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ہم جہاں تھے وہیں رک گئے۔

وہ درختوں، جھاڑیوں میں چلی گئی۔ ہم نے اس کے اور چیتے کے جانے کی آوازیں سنیں، اُنھیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

پھر کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا کہ وہ سامنے سے چلی آ رہی ہے۔ آتے ہی مسکرا کے بولی، 'کوئین اوف شیبا' مجھے کمپنی دیتی ہے۔ ورنہ یہ جگہ تو اتنی سنسان ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ آج تیسرا دن ہے جو میں نے کسی انسان کی آواز سنی ہے... مطلب، خود اپنی آواز کے علاوہ۔''

میں نے کہا، ''آپ کو سناٹا پسند ہوگا۔''... مگر میں اُس وقت صرف چیتے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

دوست نے کہا، ''ظاہر ہے...'' مجھے یقین ہے، وہ بھی صرف چیتے کے بارے میں سوچتا ہوگا۔

ہم عمارت میں داخل ہو گئے۔ ہم نے نوٹ کیا کہ اس کی تعمیر موسموں کے حساب سے ہوئی تھی۔ بادوباراں کے طوفان آئیں، بجلیاں گریں یا برفباریاں ہوں، عمارت سب کچھ جھیل سکتی تھی۔

وہ ہمیں اپنے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ فرنیچر سبک، مضبوط اور آرام دہ تھا... اور نیا تھا۔ آتش دان کچھ ہی دیر پہلے روشن کیا گیا ہوگا۔ حرارت کی نرم روئیں آتش دان سے چل کر ابھی صوفوں تک نہیں پہنچی تھیں، جہاں ہم بیٹھے تھے۔ میں نے ہلکی جھرجھری لی۔ اس نے دیکھ لیا ہوگا۔

کہنے لگی، ''بس ایک منٹ لوں گی۔ کافی تیار ہوگئی ہوگی۔ معافی چاہتی ہوں۔ باہر سردی میں انتظار کرایا۔ مگر یہ ضروری تھا۔''

وہ مصروفیت میں تیز تیز چلتی کچن میں چلی گئی، جو زیادہ دور نہیں ہوگا۔ اس کے گنگنانے کی آواز یہاں تک آرہی تھی: تومی آرآمی شے دن فولیر باشی، تومی آرآمی۔

دوست نے مجھے مسکرا کے دیکھا۔ گاتے گنگناتے لوگ کسے اچھے نہیں لگتے۔ اس نے چیتے والی میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ خود کو اور مجھے یونیورسٹی کا اُستاد بتانا، اعتماد حاصل کرنے کی کوشش تھی۔ ورنہ ہم تو صرف ٹورسٹ تھے۔ کبھی یونیورسٹی سے متعلق ضرور رہے تھے... پڑھنے کی حد تک۔

دوست نے چیتے والی کو دونوں ہاتھوں میں کافی کے مگ اُٹھائے آتے دیکھا، تو اتنی آواز میں کہ وہ بھی سن لے، مجھ سے کہنے لگا، ''تم نے ضرور کوئی نیکی کی ہوگی جس کا یہ انعام مل رہا ہے۔ ورنہ میں تو ہرگز اس عطا کے قابل نہ تھا۔''

عورت ایسی بن گئی جیسے ہماری آپس کی باتیں اس نے سنی ہی نہ ہوں۔ یہ اس کی تہذیب تھی۔ اور نہیں تو کیا۔

وہ ہمارے مگ ہمیں تھما کے گئی اور اپنی کافی لے آئی جسے ہتھیلیوں کے گھیرے میں لے کر سامنے آبیٹھی اور سوں سوں کرنے لگی۔

کچھ بھی کہنے کی غرض سے دوست نے کہا، ''اس سال کچھ زیادہ ہی سردی پڑے گی۔''

وہ کہنے لگی، ''ہر سال زیادہ ہی پڑتی ہے۔ اور پچھلے تین دن تو غضب کی سردی تھی... آس پاس کوئی نہ ہو تو مجھے بہت ٹھنڈ لگتی ہے۔''

دوست نے نہ معلوم کیوں کھوج لگانا شروع کر دیا تھا۔ ویسے ہی پوچھنے لگا، ''اچھا؟ تین دن سے سب لوگ کہاں ہیں؟''

قیامت کی چوکنا عورت تھی، جواباً بولی، ''تین دن سے سب لوگ نہیں ہیں۔''

دوست نے لہجے میں جھوٹی لگاوٹ اور مسخرا پن ڈال کر کہا، ''...اور میں پچھلے تین دن سے اپنی عمر اِن بے رنگ جنگلوں میں برباد کرتا پھر رہا ہوں! افسوس!''

اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی، ''برباد؟''

''جی ہاں۔'' دوست نے کافی کا مگ اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں وہ چمک تلاش کر لی، ''میں اگر بھٹکتا نہ پھرتا تو تین دن پہلے یہاں آچکا ہوتا۔ آپ کی اور 'کوئین' کی تنہائی دور کرتا۔ آپ نے غور کیا ہوگا، مجھے باتیں کرنا پسند ہے۔''

عورت چمک دار آنکھوں کے ساتھ کہنے لگی، ''جی، اندازہ ہوا، آپ کو اپنی آواز سننا پسند ہے۔'' پھر وہ میری طرف گھوم گئی اور ہنسنے لگی۔

''اوہو... ہو۔ تُو شے! مان گئے! آپ خوب فقرہ لگاتی ہیں!'' دوست نے کافی کا مگ میز پر رکھ دیا۔ وہ اب دُہرا ہو کر ہنسے جا رہا تھا۔

چیتے والی نے معصومیت میں سوال کیا، ''اس طرح کیوں ہنس رہے ہیں آپ؟ کیا میری بات بُری لگی؟''

''بات بُری لگے تو آدمی ہنستا نہیں ہے۔''

''زیادہ بُری لگے تو اسی طرح ہنستا ہے... دُہرا ہو کے۔''

دوست نے دونوں ہاتھ اُٹھا دیے، ''میڈم! میں سرینڈر کرتا ہوں!... سرینڈر۔ دن میں دوسری بار۔''

وہ اُس بے احتیاطی سے قہقہہ مار کے ہنسی جو خواتین کی اصل عمر بتا دیتی ہے۔ کسی بھی طرح وہ پینتیس سال سے کم کی نہ ہوگی۔ کہنے لگی، ''میرا تجربہ کہتا ہے...''

دوست نے بات کاٹ دی، ''معاف کیجیے۔ آپ کا تجربہ کچھ زیادہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی چھوٹی ہیں آپ۔''

''چھوٹی!'' اس کی آنکھوں میں شوخی کی چمک لوٹ آئی۔

''جی۔ آپ کو دیکھا تو پہلی نظر میں خیال ہوا کہ کوئی لڑکی ہے۔ کہیں انٹر ونٹر میں پڑھتی ہے۔''

''کسی بھی عورت کو یہ کہہ کر خوش کیا جا سکتا ہے کہ وہ کم عمر ہے۔ مجھے نہیں کیا جا سکتا۔ نو سر! مجھے یاد رہتا ہے کہ میری اگلی سالگرہ کون سی ہوگی۔''

اس اثنا میں دوست نے کافی کا مگ خالی کر دیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اُٹھا اور مگ اس نے آتشدان پر لگے میٹ پر رکھ دیا۔

عورت اپنی رو میں مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ دوست کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جو اس طرف گیا ہے تو چاندی کے فریم میں لگے ایک دھندلے سے فوٹوگراف کو دیکھنے گیا ہے۔ اُس کی کھوج لگانے کی اس کوشش سے مجھے شرمندگی ہونے لگی تو میں نے زور شور سے کچھ کہتے ہوئے چیتے والی کو وقتی طور پر الجھا لینا چاہا۔

دوست آتش دان والا فوٹوگراف دیکھ آیا تھا۔ اس نے بیچ میں بات اُچک لی اور اُس کے مزاج کی تحسین کرتے ہوئے کچھ کہنا شروع کیا۔

عورت سنجیدگی سے کہنے لگی، ''میرے مزاج کے بارے میں آپ کیسے کچھ جان سکتے ہیں؟''

دوست نے اتفاق کیا، ''جی ہاں بظاہر ناممکن نظر نہیں آتا ہے۔ کیوں کہ گھنٹا بھر پہلے تک مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ آپ موجود ہیں... یعنی دنیا اب اتنی سنسان اور سرد اور بے مہر نہیں رہی۔ کس نصیبوں والی ساعت میں آپ پیدا ہو چکی ہیں...''

اس نے بات بھی نہ پوری کرنے دی، بولی، ''پھر وہی!''

دوست نے اس کا موڈ بدلتے دیکھ کر کہا، ''اور اب میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ بھوکے مسافروں کو زندہ رہنے کے لیے رحمدِل میزبان کی خوشامد کرنے کے ساتھ ساتھ اسے یاد بھی دلانا پڑتا ہے کہ کھانے کا وقت ہو چلا ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی، ''باتیں، باتیں، باتیں۔'' کافی کے مگ سمیٹتے ہوئے وہ مُڑی، میری اس کی نظریں ملیں تو بولی، ''آپ کے دوست دلچسپ اور ہوشیار آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے آپ بھوکوں نہیں مر سکتے۔'' اور وہ خوش مزاجی سے نفی میں سر ہلاتی کچن کی طرف چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی دوست نے آہستہ سے کہا، ''آتش دان پر فریم میں ایک تصویر لگی ہے۔ گھریلو اسنیپ شاٹ۔ تصویر میں فوج کا ایک کیپٹن ایک چھ سات برس کی بچی اور اس کے کتے سے کھیل رہا ہے۔ بچی یہ خود ہے۔ ابھی یہ آئے تو اتفاقاً تصویر پر تمھاری نظر پڑنی چاہیے۔ پھر اسے تصویر

میں پہچان کر سرسری طور پر تم پوچھنا کہ کیا فوجی افسر اس کا باپ ہے؟''

''مگر کیوں؟'' میں نے الجھ کے پوچھا۔

دوست نے سنجیدگی سے کہا، ''بتاؤں گا۔ ضروری ہے۔''

میں نے اُسے گھور کے دیکھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔

عورت نے کچن میں کچھ کھٹ پٹ شروع کر دی تھی۔ میں نے بلند آواز میں پوچھا، ''میڈم! مدد کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں۔ میں نے کئی بار دنیا کے بعض بڑے باورچی خانوں میں چند بہترین باورچیوں کی مدد کی ہے۔ اُن سے تعریفی سندیں لی ہیں۔''

وہ ہنستے ہوئے پکاری، ''میں رسوئی میں مرد کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتی۔ ایسا لگتا ہے شیشے کے اسٹور میں بیل آ گھسا ہو۔''

دوست نے ٹہلتے ہوئے رُک کر رسوئی کی سمت آواز لگائی، ''مردوں کے بارے میں آپ بہت پاکیزہ اور بلند خیالات رکھتی ہیں۔''

اس نے خوشدلی سے ہنس کر گویا دوست کے فقرے کی داد دی۔

یہ بولا، ''ٹھیک ہے۔ میں اور میرا دوست کچن سے دور رہیں گے۔ لیکن اجازت ہو تو یہ پکنک باسکٹ آپ تک پہنچا دوں؟ اس میں ایسا کچھ ضرور ہوگا جو آپ کو یا 'کوئین' کو پسند آئے گا۔''

وہ ٹہلتی ہوئی خود ہی آ گئی۔ کہنے لگی، ''میں بھوکوں سے ان کا آخری ٹکڑا نہیں چھینوں گی۔ نہ میں ... نہ میری 'کوئین'۔ یہاں ہم تینوں کا اور 'کوئین' کا پیٹ بھرنے کو بہت ہے۔ بہرحال، شکریہ آپ کا۔''

اس نے ہمیں کمرے میں اِدھر سے اُدھر چکر لگاتے دیکھ لیا۔ میں جیسے بھٹکتا ہوا آتشدان تک چلا گیا تھا اور جھک کر وہ دھندلی تصویر دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے کہا، ''اوہ! پہچان لیا، یہ آپ ہیں۔''

''جی!'' اس نے مختصراً کہا اور جانے کو مُڑی۔

''اور یہ آپ کے ڈیڈی ہیں؟ فوجی افسر؟''

وہ جیسے اپنی ایڑی پر گھوم گئی۔ کوڑے کی طرح چٹختے لہجے میں بولی، ''نو سر!''

میں نے معذرت کے انداز میں کہا، ''اوہ!'' اور ایسی شکل بنا لی جیسے مجھ سے بہت بڑی حماقت

ہوگئی ہے۔

اُسے اپنے تیکھے لہجے پر افسوس ہوا ہوگا تو مفاہمت کے انداز میں بولی، ''ڈیڈی نہیں۔ میرے دوست ہیں، بریگیڈیر صاحب۔''

دوست اچٹتی ہوئی دلچسپی، یا سرسری تجسّس میں جھک کے تصویر دیکھنے لگا پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا، ''بریگیڈیر؟ اوں؟ بریگیڈیر سیتھی؟ نائیں۔ وہ کیسے؟ تصویر تو بہت پرانی ہے۔ نو!''

چیتے والی نے دوست کی بڑبڑاہٹ سن لی۔ کہنے لگی، ''ہاں، بہت پرانی ہے۔ بریگیڈیر بھی بہت پرانے ہیں۔ آپ جانتے ہیں انھیں؟''

''کہہ نہیں سکتا۔ اگر یہ بریگیڈیر سیتھی ہے تو ہاں۔ پہچانتا ہوں... ای وِن، اس کا یہ کنپٹی کا... تِل!...''

وہ تقریباً حقارت سے بولی، ''ہوں۔ یہ وہی ہے۔ بریگیڈیر رِٹائرڈ سعداللہ سیتھی۔''

دوست نے حیرت اور مسرت کا نعرہ لگایا، ''اوہ! اولڈ سادُلّا سیہہ! کیا زبردست کھلاڑی پیدا کیا ہے ہمارے کالج نے! آج بھی یونین ہال میں یہ بڑی پورٹریٹ لگی ہے۔''

''تو آپ دونوں بھی وہیں کے اولڈ بوائز ہیں۔'' نہ معلوم کیوں اس نے یہ بات اس طرح کہی تھی جیسے الزام لگا رہی ہو۔

میں نے دھیرے سے کہا، ''کیا یہ عزت کی بات نہیں ہے؟''

دوست فخر سے بولا، ''بے شک ہے!'' پھر ہاتھ لہرا کے کہنے لگا، ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یونین ہال کے علاوہ بھی اس کا، سادُلّا سیہہ کا... فوٹو کہیں دیکھنے کو ملے گا... وہ بھی ایسی دور دراز جگہ پر! او مائی...''

''ہنہہ!'' اس نے دوست کو نوجوان پرستاروں کی طرح لہک کر اپنے ہیرو کا ذکر کرتے دیکھا تو منھ بنا کے بولی، ''ایک دو روز ٹھہر جاؤ۔ پچاس تصویریں تمھارے 'سادُلّا سیہہ' سے آٹو گراف کرا کے ساتھ کر دوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے چلی گئی۔

''ری یلی!؟'' دوست نے جاتی ہوئی عورت کی طرف جیسے جوش اور اشتیاق سے کانپتی ہوئی اپنی آواز پھینکی، ''واقعی؟ پکا؟'' پھر اس نے میری طرف دیکھ کر چالاکی کا اشارہ کیا۔

چیتے والی کچن سے آگے کہیں جا چکی تھی۔ دوست کہنے لگا، ''عورت باقاعدہ اس لگڑ بگھے سے بیزار ہے جسے یہ اپنا 'دوست' کہتی ہے، جس کے ساتھ کھینچی گئی ایک پرانی تصویر اس نے یہاں لگا رکھی ہے، جو ایک دو دن بعد یہاں آنے والا ہے... آہ پیارے واٹسن! یہ کیا اسرار ہیں؟''

میں نے بیزاری سے کہا، ''ہُو کیرز!''

وہ بولا، ''آئی ڈُو!... اور یہ سب میں شام سے پہلے معلوم کرلوں گا۔ تم نے سنا؟ وہ کہہ رہی تھی اس کا یہ 'دوست' آنے والا ہے، ہمیں اُس کے آنے سے پہلے...''

میں چڑ گیا، ''ہاں!... 'آنے سے پہلے'... ہم اس عورت کے گھر رہنے نہیں آئے ہیں مسٹر!... اور نہ جاسوسی کرنے۔''

''ٹھیک ہے!'' اس نے روکھے پن سے کہا۔ پر وہ الجھنا بھی نہیں چاہتا تھا، کہنے لگا، ''پیارے! ہم یہاں ہیں، تو جو نظر آرہا ہے اسے سمجھنے میں کیا حرج ہے؟ اس لیے کہ ہم 'یہیں' ہیں اور جو ہو رہا ہے ...وہ ہماری آنکھوں کے سامنے... یا کم سے کم، اس کے شواہد تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں...''

''اچھا ہے۔ تم دیکھو۔ مجھے پروا نہیں۔ مجھے شامل مت کرو۔''

''بُرا کیوں مانتے ہو۔ چلو تمھیں شامل نہیں کروں گا... فی الحال۔'' یہ کہہ کے وہ ڈھیٹ پن سے ہنسنے لگا۔ مجھے معلوم تھا وہ باز نہیں آئے گا۔

کافی دیر تک ہم ڈرائنگ روم تک محدود رہے۔ چیتے والی اس بریگیڈیر رِٹائرڈ سیتھی کے ذکر سے بے کیف ہو کر گئی تھی۔ جتنی دیر وہ کچن میں مصروف رہی بالکل بھی نہ گنگنائی۔ دوست نے مصنوعی تاسف کے ساتھ جیسے خود سے کہا، ''وائے افسوس! ایک لگڑ بگھے کا ذکرِ کثیر کرتے ہوئے میں نے ایک نغمے کی راہ روک دی۔''

مگر وہ کچن سے فارغ ہو کے آئی تو اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں میں پہلے جیسی چمک لوٹ آئی تھی۔

آتے ہی کہنے لگی، ''کھانے کی میز پر آجایئے۔ کھانا تو نہیں ملے گا، کچھ ٹِڈ بِٹس مل جائیں

گے۔ اتنا تو ہوگا کہ آپ دونوں کی ڈھارس بندھی رہے گی۔ جتنی دیر آپ انتظار کریں گے، اتنے میں 'کوئین اوف شیبا' اپنا راتب پورا کر لے گی۔''

دوست نے اصرار کر کے اسے 'کوئین اوف شیبا' کے لیے پکنک باسکٹ سے ایک روسٹڈ چکن لے جانے پر آمادہ کر لیا۔ وہ خوش ہو کے بولی کہ ''کوئین' کو چکن بہت پسند ہے... زندہ، روسٹڈ، کچا... ہر طرح کا۔''

جیسے ہی وہ کھانے کے کمرے سے نکلی، دوست جھپٹتا ہوا، جائزہ لینے، بیڈروم میں گھس گیا۔

''یخ!'' میں نے نفرت سے دل ہی دل میں کہا۔ ''یہ کوئی بات ہے!''

وہ دو تین منٹ غائب رہا پھر تیزی سے آیا اور حیرت کے ڈرامائی اظہار میں، دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے سرگوشی میں بولا، ''یار! میں... وہ دیکھ کر آ رہا ہوں جو ناقابلِ یقین اور شرمناک ہے۔''

مجھے غصہ آ گیا، ''شیم آن یو!''

وہ بڑبڑاتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ کیا پاگل پن ہے! مجھے اُسے روکنا چاہیے۔ مگر میں بیٹھا رہا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ لوٹ آیا، ''اِدھر یہ گن روم ہے... ہتھیار ہیں سب طرح کے اور شکاری تھیلے، کارتوس پیٹیاں، خنجر، کھکھریاں، بوٹ۔ سمجھ رہے ہو؟ یہ سب اُس شکاری جانور کا ذخیرہ، اس کا 'ٹین ٹپ پڑ' ہے۔ مگر یہ کچھ نہیں۔ اُدھر جو دیکھ کے آیا ہوں۔ اووف!'' اُس نے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔ ''اوو مئی گاااڈ!''

میں پھٹ پڑتا، مگر اسی وقت برآمدے کے چوبی فرش پر جوتوں کی تیز ٹھک ٹھک سنائی دی۔ میں خاموش رہا۔

ہم اپنی کرسیوں پر ڈھیلے ڈھالے ہو کے بیٹھ گئے۔

وہ ہماری طرف آئی اور معذرت کرتی اپنے بیڈروم میں چلی گئی، جہاں سے کچھ دیر پہلے میرا دوست پھیرا لگا کے آیا تھا۔

غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔ وہ چیتے کو راتب دے کر فارغ ہو گئی تھی اور اب میز پر آنے کو تیار ہو رہی تھی۔ میری برہمی کی ذرا بھی پروانہ کرتے ہوئے دوست نے کرسی اور

قریب کھسکالی، آواز دبا کے بولا، ''اس کے آنے سے پہلے سن لو۔ یہاں ایک ہی بیڈروم اور ایک ہی مسہری ہے۔ لنگڑ بگھا یہاں رات گزارنے آتا رہتا ہے... بات تو سنو یار! یہ عورت اس کی رکھیل ہے۔ میں نے وہاں کونڈومز کا اسٹاک دیکھا ہے... پلیز! پلیز!... بات کرنے دو مجھے... سائڈ ٹیبل کا تالا کھول کے دیکھ لیا میں نے۔'' اس نے اپنی مٹھی کھول کر ایک سیدھا کیا ہوا پیپر کلپ دکھایا۔ ''وہ سالا اُسے ہنٹر سے مارتا ہے اور اس حالت میں اپنی، اُس کی تصویریں کھینچتا ہے۔''

''ارے!''

''ہاں۔ اور یہ سب اس عورت کی رضامندی سے ہوتا ہے... شکار کے علاوہ، بریگیڈیر 'ساڈلا سیہہ' کا واحد مشغلہ اب یہی ہے۔''

''او مائی گاڈ!''

''جی! اب آئی سمجھ میں؟... اذیت پہنچا کے لطف لیتا ہے، حرامی۔''

''وہ... یہ سب کیوں جھیل رہی ہے؟... پیسے کے لیے؟''

''شاید سروائیول کے لیے۔ ہاں پیسا بھی ایک کنسیڈریشن ہوگا۔ کیونکہ اُس سالے کے پاس طاقت ہے... دولت کی اور ہتھیار کی... اور ایک بہت بڑے جھوٹ کی۔''

غسل خانے سے آتی پانی گرنے کی آواز بند ہو گئی۔ دوست نے بدن ڈھیلا چھوڑ کے جماہی لی۔ ہم نے اس کی آمد کی تیاری کر لی تھی۔

مگر وہ دیر کر کے آئی۔ اور وہ آئی تو اس کمرے میں، بلکہ پورے 'لاج' میں روشنی ہو گئی...

وہ شفتالو کے دھیمے رنگ کے اسکرٹ بلاؤز میں تھی اور بلاؤز میں کہیں کہیں شعلہ زن نارنجی رنگ کے پھول کڑھے تھے اور گلے میں وہ گلابی مروارید کی سہ لڑی اور کانوں میں ویسے ہی آویزے پہنے تھی اور بال اس کے ہر قید سے آزاد تھے اور یہ کہ لبوں پہ وہ ہلکی سرخی لگائے، نوک دار پاپوش پہن کے آئی تھی۔

اُس نے آتے ہی کسی تیز و طرار طالبہ کی طرح (کہ جب وہ کلاس روم میں ہمجولیوں کے ساتھ اکیلی ہوتی ہے) منھ سے بگل کی آواز نکالی، ''ترارم! ترارم! توجّہ! جنٹلمن، توجّہ!''

ربِ لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+

ہم دونوں اس کی آمد کے سچے احترام میں کھڑے ہو گئے۔

دوست نے اچانک نقیبوں کی سی کھنکھناتی آواز میں منادی کی، ''سب کورنش سلامی ملکۂ عالیہ کے لیے! سلامی! سلامی! زیریں اور بالائی نیل کی تاجدار، لافانی قلوپطرہ کے لیے سب کورنش سلامی!''

وہ بیدِ مجنوں کی شاخ جیسا اپنا ایک بازو شانے کی سیدھ میں پھیلا کر ایک بار پوری گھوم گئی۔ اس گردش میں کسی باکمال بیلے رقاصہ کا بہاؤ اور طنطنہ تھا۔ مجھے لگا میں اتنا حسن برداشت نہ کر پاؤں گا۔ رو پڑوں گا۔ مگر پھر اس نے اپنے گلنار چہرے سے ہنسنا شروع کر دیا۔ مرحبا!

دوست اپنی سب اداکاری جیسے بھول چکا تھا۔ آہستہ سے کہنے لگا، ''سلامی! خالص چاندی کی ان گھنٹیوں کے اعزاز میں سلامی!''

وہ آگے آئی، اس نے کسی رائیلٹی کی طرح ایک روزمرّہ تمکنت کے ساتھ، جو انکسار کی طرح فطری معلوم ہو رہی تھی، دوست کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ دوست نے بلّور کی اس چھڑی کو پورے احترام سے تھام لیا، ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا اور الٹے قدموں ہٹا، تو میں بڑھا، لمحے بھر کو اس کی بے داغ کہنی سے اوپر، بازو کی صحت مند گلابی جلد میں مجھے ایک دھبا سا دکھائی دیا۔ کسی جانور کے....جی نہیں! نہ! وہ جانور کے دانتوں کا زخم نہیں تھا... پر میں نے دیکھا کہ اس کے بھرے بھرے بازو کے گھماؤ پر انسانی دانتوں نے ایک گڑھا سا بنا دیا تھا جو مندمل ہو گیا تھا۔ مگر اس پرانے زخم کے کنارے اُودے پڑ گئے تھے جنھیں پاؤڈر کی تہہ جما کر غائب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

احترام کے قابل یہ انسانی بدن خود آدمی کے ہاتھوں کیسی توہین برداشت کرتا رہا ہے... (کرتا رہے گا؟)۔

میں نے اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے، خیال ہی میں، بازو کے مندمل زخم کو بوسہ دیا اور اُلٹے قدموں اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ وہ اپنی بے خبری میں مسکراتی رہی۔

جو بھی اس نے پکایا تھا، ہم نے خوش ہو کے کھایا۔ ہم دونوں نے چیتے والی کی مہارت اور اس کے ہاتھ کے مزے کی تعریف کی۔ سن سن کے وہ نہال ہوئی جاتی تھی۔

ابھی کھانا ختم نہیں ہوا تھا کہ گڑگڑاہٹ اور گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ بادلوں کی گرج سے الگ ایک بے چین ہونک، 'لاج' کے پچھواڑے سے سنائی دے رہی تھی۔ آواز سب نے سُنی۔ وہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

دوست نے پوچھا، ''کیا بات ہے؟''

'''کوئین' ایسے موسم میں بے چین ہو جاتی ہے۔ میں پاس بیٹھ کر تسلی دیتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ میں اٹھایا نیپکن میز پر ڈال دیا۔ ''معافی چاہتی ہوں۔ وہ مجھے تلاش کر رہی ہے... 'کوئین'... بہت بے چین ہے۔'' اور چیتے والی چل پڑی۔

''ہم بھی چل رہے ہیں۔'' دوست نیپکن پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی ساتھ دیا۔

''نہیں۔ پلیز آپ لوگ کھانا کھائیے۔''

''سیر ہو کے کھا چکے۔'' میں نے کہا، ''اب آپ کے اور کوئین کے پاس بیٹھیں گے۔''

وہ معذرت کرتی رہی۔ بار بار کہتی رہی کہ وہ جگہ مہمانوں کے بیٹھنے لائق نہیں ہے اور یہ کہ ہم نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا ہے مگر ہم دونوں چل پڑے۔ اس کے پیچھے پیچھے عقبی برآمدے میں نکل آئے۔ یہاں سے پختہ روش ایک آؤٹ ہاؤس تک گئی تھی۔ روش پر سخت موسموں سے بچاؤ کے لیے نالی دار چادروں کی چھت ڈالی گئی تھی۔ مگر طوفانی بارشوں نے ٹین کا یہ سائبان اس وقت بے مقصد کر دیا تھا۔

چیتے والی، اس ترچھی بوچھار میں بھیگتی دیوانہ وار آؤٹ ہاؤس کی طرف بڑھتی رہی۔ سائے کی طرح ہم اس کے ساتھ تھے۔ گھنے بادلوں نے اچانک ہی اندھیرا کر دیا تھا۔

ہمارے ہونے نہ ہونے سے قطعاً بے پروا، وہ اپنی 'کوئین' کو چمکارتی، پیارے ناموں سے بلاتی، آؤٹ ہاؤس کے دروازے سے جا چمٹی۔

اس نے چابی نکال کر جیسے تیسے تالا کھولا اور آؤٹ ہاؤس کے اندھیرے میں داخل ہو گئی۔ میں اُسے داخل ہونا نہیں کہوں گا، وہ تو جیسے اندر جا پڑی تھی۔

چیتے نے اس کی بو پا کر اور بھی بے چینی سے ہونکنا اور اُچھل کود کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہم نے عورت کے دیوانہ وار چمکارنے اور زنجیر بجنے کی تیز آوازیں سنیں۔ وہ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی۔

کچھ دیر تک یہ سب ہوتا رہا، پھر آؤٹ ہاؤس میں سکون ہوگیا۔

باہر قیامت کی طوفانی بارش تھی مگر تاریک آؤٹ ہاؤس سے لاڈلے بچے کی طرح چیتے کی کلکارے جیسی آواز آرہی تھی۔ اور چیتے والی کی گنگنانے کی آواز بھی۔ وہ اُسے کسی طرح کی لوری سنارہی تھی۔

میں اور دوست، ٹین کے ناکافی سائبان تلے ترچھی بوچھار میں بھیگتے اور کڑی سردی میں کانپتے رہے۔ کیا بُرا تھا اگر ہم نے عورت کا کہا مان لیا ہوتا اور یہاں آنے سے باز رہے ہوتے۔

کچھ دیر تک وہ 'کوئین اوف شیبا' کو لوری جیسی سناتی رہی۔ پھر لگا کہ جیسے 'کوئین' سوگئی ہے۔ پھر آؤٹ ہاؤس میں کسمساہٹ سی ہوئی اور چیتے والی باہر آئی، اس نے آہنی دروازہ بند کیا، تالا ڈالا، چابی سنبھالی، سر اُٹھا کر ہمیں دیکھا اور ٹھٹھک گئی۔

"اوہ! آپ دونوں یہاں کیا کررہے ہیں؟"

دوست نے کہا، "یاد کیجیے۔ ہم آپ کے ساتھ 'کوئین' کو تسلی دینے آئے تھے۔"

"ارے توبہ! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ سوری! آپ اندر کیوں نہیں آگئے؟ باہر کھڑے کیوں بھیگتے رہے؟ کمال کیا آپ دونوں نے۔"

مگر کمال اس نے کیا تھا۔ پوری یکسوئی سے توجہ دے کر، اپنی چاہت کا اعجاز دکھا کر اور اپنی آواز سنا کر اس نے چیتے کو سلا دیا تھا۔ ایک کٹیلے کو پرسکون کردیا تھا جبکہ طوفان کا زور ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ بادل اُسی طرح گرج رہے تھے۔

ہم 'لاج' کے پچھلے برآمدے سے ہوکر کھانے کے کمرے میں آئے تو اس نے کم روشنی دیکھ کر لائٹر اٹھایا اور گوشے میں کھڑا گیس کا ہنڈا جلا دیا۔ پھر ایک دوسرے کو اور خود کو دیکھ کر ہم تینوں نے حیرت اور تمسخر اور صدمے کی ملی جلی آوازیں نکالیں۔

اور چیتے والی نے توبے رکے ہنسنا شروع کردیا۔ کیونکہ سب سے زیادہ تباہ حالت میں وہ خود تھی۔ شعلہ زن نارنجی پھولوں والا سبک ریشمی بلاؤز اور اسکرٹ اب شفتالو کے رنگ کا نہیں رہا تھا۔ بارش، کیچڑ، گھاس پھوس، کچرا اور مسلے ہوئے پتّوں کا مٹ میلا سبز رنگ اور آؤٹ ہاؤس کے آہنی دروازے یا کسی پنجرے کی سلاخوں سے چھوٹا ہوا زنگ آلودہ پینٹ اس کے رخساروں پر اور لباس پر

اُتر آیا تھا۔ دونوں نازک جوتوں کا رنگ اور آکار زیادہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جوتوں کی جگہ اب اس کے ننھے پیروں سے کیچڑ میں کچلے ہوئے جیسے دو مُردہ جانور لپٹے تھے۔

مگر چیتے والی بے رکے ہنسے جارہی تھی۔ اس کے سانولے روشن چہرے پر بوچھاروں نے ناہموار لکیریں بنادی تھیں جو کیچڑ کے چھینٹوں اور پنجرے کے نشانات کو کاٹتی پیشانی سے ٹھوڑی کے چاہ تک پہنچی تھیں۔ مجھے شبہ تھا کہ سبھی بوچھاروں کے ریلے نہیں تھے، ان میں آنسوؤں کی لکیریں بھی ہوں گی۔

عجیب عورت تھی وہ!

بہت دیر اس نے ہمیں سردی میں لرزنے نہیں دیا۔ ہم دونوں کو ایک ایک کمبل دے کر بیڈروم کی عافیت میں بھیج دیا تاکہ ہم خود کو گندے گیلے کپڑوں اور کچرے کیچڑ سے صاف کرلیں اور آدمی کی جون میں آجائیں۔

ہم اس کے غسل خانے سے بریگیڈیر کے کپڑے زیب تن کیے اور کمبلوں میں لپٹے کھانے کی میز پر پہنچے تو ہم نے آوازوں سے معلوم کیا کہ وہ کچن میں مصروف ہے۔ وہاں برتن بج رہے تھے اور اس کے گنگنانے کی آواز آرہی تھی: تومی آرآمی شے دن فولیر باشی، تومی آرآمی۔

کچھ دیر بعد دونوں ہاتھوں میں کافی کے مگ اٹھائے وہ آئی تو ہم نے اس کا ایک نیا روپ دیکھا۔ وہ کشمیری پیراہن اور تنگ شلوار میں تھی۔ اس کے سرکش بالوں پر کشمیری ہاتھوؤں والی اِسکل کیپ جمی تھی۔

نہ معلوم کیوں میں سمجھ رہا تھا کہ اب جو وہ ہمارے برابر بیٹھی آسائش سے کافی سِپ کررہی ہے تو اپنے چیتے کے بارے ہمیں کچھ بتائے گی۔ مگر اس نے چیتے اور لگڑ بگھے کے سوا ہر چیز پر بات کی اور ہمیں اپنی آواز سے رَندا سا کردیا۔ طوفان تھم گیا تھا۔ سہ پہر کے سناٹے اور دن بھر کی مشقت سے ماندہ بدنوں کو آرام کی ضرورت تھی۔

ہم دونوں کو اونگھتے دیکھ کر وہ نسبتاً فراخ سیڑھیاں چڑھا کر ہمیں اوپر کسی کمرے میں لے گئی۔ یہ مہمانوں کا کمرہ ہوگا۔ لیکن شاید کوئی مہمان ابھی تک یہاں ٹھہرا نہ ہوگا۔ بستر نئے نکور اور آرام دہ

تھے۔ ہم اتنی نیند میں تھے کہ ٹھنڈے گدے اور کمبل بھی ہمیں اپنی آنکھیں کھلی رکھنے پر مجبور نہ کر سکے۔

خدا معلوم کتنی دیر سوئے ہوں گے کہ کسی بات سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ یاد آیا۔ ہم نے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سُنی تھی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ہم نے پورچ میں داخل ہوتی آرمی سرپلس کی ایک جیپ دیکھی۔ بریگیڈیر رِٹائرڈ ساڈُلا سیہہ آ چکا تھا۔

ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور اس کنٹری ہاؤس سے نکل آئے۔

مگر ہم ابھی تک اُس کے جنگل کے آس پاس، اُس کی اتھاہ نظر آنے والی کھائی میں موجود ہیں۔

ہمیں اندازہ ہے کہ یہیں کہیں بے مثال حسین گرد و پیش میں وہ دل آویز کنٹری ہاؤس کھڑا ہے جو ایک بظاہر توانا 'ساڈُلا سیہہ' نے اپنی کہنگی اور ہوسناکی سے بولا کر اور اپنی لوٹ مار کی صلاحیت سے بہرہ مند ہو کر صرف شونالی کو وہاں رکھنے، انتظار کرانے کے لیے حاصل کر لیا ہے۔

وہ کبھی بھی، اپنی کہنگی اور ہوسناکی میں لتھڑا ہوا، بس ایک دن ایک رات کی مدت کے لیے شونالی کو ستانے یہاں آ جاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جب تک یہ شونالی زندہ ہے، وہ اسی طرح آتا رہے گا۔

ابھی تو یہی سب چل رہا ہے۔

مگر میرا دوست اور میں ...اور شونالی ...ہم تین یہ بات جان گئے ہیں کہ یہ زیادہ دن نہیں چلے گا۔

کیونکہ ہر شونالی نے اپنے اپنے ساڈُلا سیہہ سے چھپ کر ایک ایک چیتا پال لیا ہے۔

اُن سب کی کہانیوں میں ایک یہی بات حوصلہ دینے والی ہے۔

روپالی

''آئینِ اکبری'' میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ، روپیا، در زمانِ شیرخان پدید آمد۔

پھر آثارِ قدیمہ اور اس سے متعلق علوم — علمِ کتبہ شناسی اور علمِ سکہ شناسی — کے بدیسی ماہروں اور سیانوں نے آگے یہ بھی لکھا کہ شیر شاہی روپے کا صافی وزن ایک سو اسّی جرین ہوتا تھا، جس میں ایک سو پچھتر جرین سیم خالص کے ہوتے تھے، یعنی کھری چاندی کے۔

اور لکھا کہ چاندی کا سکہ پہلے ''ٹنکا'' کہلاتا تھا۔

شیر شاہ نے پہلی بار اس سکے کو ''روپیا'' کہا، اس لیے کہ چاندی کے لیے سنسکرت میں ایک بجتا کھنکتا لفظ روپالی پہلے سے موجود تھا۔ اور یہ کانوں کو بھلا لگتا تھا۔

اس طرح اپنے سکے کو روپیا کہہ کر شیر شاہ نے (کہ جس کا دادا، اپنے بیٹے کو لے، گومل ندی کے پاس کے گاؤں روھری سے اٹھ کے آیا تھا) یقیناً ہند کے وسطی اور جنوبی اور شمالی اور شرقی ممالک کی رعیت کے بیچ ایک نوع کی مقبولیت حاصل کی ہوگی، جو اچھی بات ہے۔ پہلے کے مسلم سلاطین اپنے سکے جاری کرتے تو ان پر سرتاسر عربی خط میں اپنا نام اور سال ضربت اور سلامتی کی دعا لکھواتے تھے کہ...خلداللہ مُلکہٗ وسلطانہ۔

شیر خان نے نام اور خلداللہ...کے ساتھ ناگری خط میں بھی اپنا نام لکھوا دیا تاکہ کھیتوں کھلیانوں میں اور بازاروں میں اور اینٹوں کے بھٹوں پر اور لوہاروں کی دکانوں میں گھن چلاتے

ہوے اور صرافے میں سادہ کاری کا کام کرتے اور خراد پر کٹائی کرتے کاری گر اور باڑیوں، چوپالوں میں آنند سے بیٹھے ہزار ہا ہزار کی تعداد میں ہند کے باشندے (جن میں سے تقریباً سبھی عربی خطے ناواقف تھے) جان لیں۔

یہ جان لیں کہ روپیا ان کا اپنا سکہ اور شیر خان ان کا اپنا سلطان ہے۔

سلطنتوں کا اور باجبروت سلطانوں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی موجودگی کا اثبات ہتھیار کے بل پہ کرتے ہیں (اور کرتے تھے اور کرتے رہیں گے)۔ تاہم شوکت وشکوہ کی اس موجودگی کی خبر مہر ومروّت سے اور دیانتداری سے بھی دی جا سکتی ہے۔

تو شیر خان نے اپنی رعیت کو یہ بات سونے میں اور چاندی میں لکھ کے دی کہ میں، شیر خان، تمھارا سلطان، تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔

مشرق اور مغرب کی بادشاہت بے شك اسی پروردگار کو زیبا ھے جو سب سمتوں کا اور سب زمانوں کا پالن ہار ھے

اور کیونکہ جنوب میں شیر خان کی مملکت دور تک پہنچی ہوئی تھی... اس لیے وہ کہتا تھا کہ اس طرف ولایتِ مالوہ ہے جو میری مملکت کا چمن ہے۔

(جب کہ فی الاصل ایسی کوئی سرسبزی وشادابی وہاں نہ تھی۔)

تو کیا شیر خان نے اس ولایت کو اپنی مملکت کا چمن محض ارتجالاً کہا تھا؟ یا وہ امید کرتا تھا کہ جلد یا بدیر ایسا ہو رہے گا؟ واللہ اعلم۔

اور وہ کہتا تھا کہ مندو کا شہر ولایتِ مالوہ کا دل ہے۔ درست۔

اور وہاں سلطانِ عادل کے حکم کے بموجب عمارتوں کا سنِ تعمیر دکھانے والی پتھر کی سلوں پر اور شاہی فرامین پر ناگری خط میں ''مانڈو'' اور فارسی میں ''مندو'' لکھا جاتا تھا۔

اور ویسے بھی کتنے ہی فرامین ایک ہی ورق پر ناگری اور فارسی خط میں برابر برابر لکھے جاتے تھے۔ لوگوں کے دل جیتنے کا ایک لکھشن، ایک ڈھنگ یہ بھی ہے۔

یہ مندو پہلے مانڈو کہلاتا تھا۔ تو لودھی سلاطین نے اسے صرف مندو کہہ کے بلایا۔ مغلوں نے اسے کبھی شادی آباد، اور کبھی شادماں آباد کہا۔

سوریوں کے لیے یہ لکھت میں بھی اور بولنے میں بھی مانڈو (اور مندو) رہا۔

تو اب میں اس شہر کے ایک یارباش آدمی لکھوا خشت ساز اور اس کے یاروں کا حال سناتا ہوں۔

مانڈو شہر کا لکھوا خشت ساز — حرام الدہر — نشے کا عادی تھا۔ کیا کرتا وہ۔ بہت پیسا آ گیا تھا سرے کے پاس۔ جب سے ولایت مالوہ سلطان کی قلمرو میں شامل ہوئی تھی اور شجاعت خان سوری کو یہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا مانڈو نگر میں، جو صوبے کا صدر مقام تھا، گھر پہ گھر اور باڑیوں پہ باڑیاں بنی شروع ہو گئی تھیں۔

لکھوا کا اینٹوں کا بھٹا، جس سے اسے گزارے لائق آمدن ہو جایا کرتی تھی (اور کبھی نہیں بھی ہوتی تھی)، اب سارا ہی سال، آٹھوں پہر، کام والوں کے شور سے اور آتی جاتی گاڑیوں کی چلو چلو سے چھلکتا رہتا تھا۔ مشکل سے ساون کے گنتی کے دنوں میں ٹھنڈا پڑتا ہوگا یہ بھٹا۔

شہر کا سب سے جنگی بھٹا تھا یہ۔ اور شہر بھی وہ کہ نربدا ندی کے آس پاس دوسرا اور کوئی شہر اس کینڈے کا کب کسی نے دیکھا ہوگا؟

مندو شہر نہ تھا، مالوے کی معتدل آب و ہوا کا استعارہ تھا جسے بسانے والوں نے سرخ پتھر کی حویلیوں اور لکھوری اینٹوں اور چونے اور گچ سے اٹھائے گئے مکاناتِ عمدہ سے سجایا تھا اور جا بجا چمن بندی کی تھی۔ بیرونِ قلعہ، یعنی حصار سے نکلو تو باغوں میں پھلدار درختوں کے عرشِ اعلیٰ پر آموں کے سرمست موسم میں کوئلیں کوکتی تھیں اور سیاہ چمکیلے بھونرے پھولوں کے کنجوں میں گنجار کرتے تھے۔

مجموعی طور پر امن و امان کا راج تھا۔ کس لیے کہ شیخ اسماعیل شجاعت خان سوری، حاکم مندو کا ہاتھ لوہے کا ہاتھ تھا جو خطا کاروں کو اپنے راست طریقے سے اور کبھی دائیں بائیں سے اور کبھی عقب سے، ان کی بے خبری میں آن پکڑتا تھا۔

وہاں بھانت بھانت کے لوگ رہتے تھے۔ ظاہر ہے مانڈو آدمیوں کی بستی تھی، سب فرشتے

نہیں تھے وہاں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ کمہار محلے میں لکھوا جیسے کھاتے پیتے سفال فروشوں نے، جشن کے کئی موسم میں، کمال ہوشیاری سے شراب کی ایک بھٹی قائم کر کے مکان در مکان اسے اپنے محلے میں چھپا دیا۔ ایسا تھا کہ خاموشی سے پی پلا کر گھر جا کے سو رہنے والوں کو کیا پڑی تھی جو وہ کسی باہر والے سے کچھ کہتے۔ کسی اور کو بھی اس سے غرض نہیں تھی کہ کون کیا کر رہا ہے۔ تا آنکہ بھٹی کا ہونا دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔

شاہی عمالوں کو سن گن ملی ہو گی تو انھوں نے دو چار مہینے جانچ پڑتال کر اندازہ لگایا ہوگا۔ اور جب دیکھا ہوگا کہ شراب پینے والے کوئی غل غپاڑہ نہیں کرتے اور ان کی مے نوشی سے کسی طرح کا فتور عامۃ الناس کے مشاغل میں نہیں پڑ رہا تو انھوں نے درگزر کیا ہوگا۔ بس دیوانِ شرطہ کی نچلے درجے کی مسلوں میں سب کوائف لکھ کے سنبھال رکھے ہوں گے کہ اگر آگے کوئی فتنہ اٹھے اور یہ مے نوشی الجھن کا سبب بنے تو شکایتوں کا ازالہ کیا جائے۔

مناسب بات تھی۔

کس لیے کہ ضرورت پڑنے پر کوئی دیر نہ لگتی تھی۔ اللہ یار کوتوال کے شرطے آتے اور فسادیوں بدمعاشوں کی مشکیں کس کے انھیں بند گاڑیوں میں لے جاتے تھے۔

لکھوا خشت ساز خود اپنی اور اپنے مہمانوں کی تواضع کرنے دارو کی بھٹی پر خوب آتا تھا۔

ابھی بھی تین مہمان اس کے ساتھ تھے۔

لکھوا کے ان مہمانوں نے برسات کا موسم ختم ہونے پر یہاں بھٹی پر آنا شروع کیا تھا۔ پر ان کا آنا کسی کو اچھا نہیں لگا تھا۔

ویسے تو ہمیش کے آنے والوں میں کتنے ہی سفال ساز، خردار، چمر قصاب، کمی، کام والے آتے ہی رہتے تھے۔ کبھی کوئی نداف، لہار، ہنرمند بھی آنکلتا تھا۔ تاہم یہ سفال ساز، قصاب، لہار، وغیرہ لکھوا کے ان تین مہمانوں سے کسی عنوان مانوس نہ ہو پائے تھے۔

ماندو کے شہری... کیا اشراف... کیا عامی، سبھی نرم سبھاؤ اور دھیمے طور طریق کے لوگ تھے۔

اونچی آواز میں بات کرنا یہاں کا دستور نہ تھا۔ تو لکھوا کے ساتھ لگے چلے آئے یہ چھچھورے بڑبولے انھیں کیوں اچھے لگتے؟

اس وقت بھی لکھوا کے یہ مہمان پینے بیٹھے تھے تو آپس میں اور اپنے میزبان سے اونچی آواز میں باتیں کیے جا رہے تھے۔ ایک ان میں ایسا سفلہ مردار تھا کہ ہر تھوڑی دیر بعد بلند آواز سے گوز صادر کرتا تھا، پھر طمانیت کے ساتھ دائیں بائیں دیکھ کے آسائش میں سر ہلاتا تھا۔ ذرا بھی خیال نہ کرتا تھا کہ اکیلے ایکانت میں نہیں آدمیوں کی مجلس میں بیٹھا ہے۔ دوسرا بدبخت ہنسی ہنسی میں کتنی بار اپنی کٹار بے نیام کر چکا تھا۔ تیسرا ابھی اس کی دیکھا دیکھی ایسا ہی کرتا تھا۔ کچھ یوں لگتا تھا جیسے سسرے آپس میں خونم خون ہو جائیں گے یا محفل میں کسی کو زخمی کر دیں گے۔ ان میں سے وہ جس کے رخسارے پہ چار انگل کے گھاؤ کا نشان تھا، کئی بار بنارسی کور والی چادر میں لپٹا اپنا تفنگچہ کسی نہ کسی بہانے محفل کو دکھا چکا تھا۔

ماندو کے چمر قصاب منگو نے برابر بیٹھے دینو حمال کے کان میں کہا، ”دینو میاں! ہو نہ ہو یہ تفنگچہ چوری کا ہے۔ ایسے نئے چمچماتے تفنگچے بنگالے سے آنے والے پرتگالی گوروں کے پاس یا پھر ارکاٹ کے راجوں مہاراجوں کے پاس ہی مل سکے ہیں۔“

”ہاں رے،“ دینو کہنے لگا، ”یہ والی تفنگ تو شیر شاہی عسکریوں کے پاس بھی مشکل سے نکلے گی۔“

دینو میاں حمال کا یہ بھی کہنا تھا کہ لکھوا چودھری نے برا کیا ہے جو بنا پوچھے ایسے بدقواروں کو محفل میں لے آیا۔ منگو کا خیال تھا کہ ایسے پاہنوں کو کون مجوان بنا پوچھے لا سکتا ہے۔ ناں میاں ناں، لکھوا چودھری کمہاروں سے پوچھ کے ہی ان ڈنگروں کو لایا ہے۔

لکھوا پہلے کتنی بار مہمانوں کا ”راتب“ کپیوں، مشکیزوں میں بھروا کے لے جاتا رہا تھا۔ اور اب جو انھیں بھٹی پر لایا تھا تو سب سے یہ کہہ کے ملواتا تھا کہ ہمارے یہ پاہنے بڑے جبر جنگی ٹھاکر ہیں۔ کہتے ہیں باگھیل کھنڈ سے آگے چالیس پرگنہ میں اور اڑیسہ راج میں ان کے بڑے کھیت کھلیان تھے۔ پر جب سے وہ علاقہ شیر شاہی قلمرو میں آیا ہے سب نیچ پاسیوں، چماروں، ڈھیڑ، کولیوں کے پر لگ گئے ہیں۔ شاہی زمینیں آباد کر رہے ہیں۔ وہ چھوٹ ملی ہے انھیں کہ بولوئی رام۔ جنھیں ایک پیسا مجوری کی آس پہ، یا چار مٹھی چاول دکھا کے ٹھاکر لوگ بیگار میں گھیر لیتے تھے، وہ شیر شاہی بندوبست

میں ایسی شہ پا گئے ہیں کہ من مانی مجوری پہ ہی آتے ہیں، ویسے نہیں۔ جو حرام کے جنے تانبے کے سکے کی شکل دیکھنے جوگے نہیں تھے، اب انٹی میں شیر شاہی روپیا دو روپیا لگا کے رکھتے ہیں۔ دکھائے پھرتے ہیں سب کو کہ دیکھو، کھری چاندی کا روپیا ہے۔ یہ جمانہ آ گیا ئے!

ہمیں تو لگتا ہے ایسے ایسے دس بیس روپیے گھر میں بھی گاڑ کے رکھتے ہوں گے کھودی کے! جبھی اپنی شان شوکت دکھا کے پھولے چلے جا رہے ہیں۔ کم جرفے!

دینو یہ سب سن کے منھ بنانے لگا، منگو سے بولا کہ تو کا ہے کوان چیڑ قناتیوں مرداروں کی بدباتیں دُہرا ریا ئے؟ یہ تو اللہ میاں کا کرم ہے جو بے آسروں کا سردھرا اس نے بھیج دیا ہے۔ نہیں تو بھائی! کون بادشاہ کسی کتی، کام والے کی فکر کرتا ہے۔ سنا نہیں وہ چوتا راجا پورن مل رائے سین والا کیا کر ریا ئے؟ کاں کے ہندو، کاں کے مسلمان، سبری رعیت کی ٹنڈی کسوا دی ہے حرام کے تخم نے۔

تفنگچے والا مہمان اب پھر اونچی آواز میں سب کو سنا سنا کے بتا رہا تھا کہ اب اُدھر زمین داری ٹھاکری کا مزہ نہیں رہا۔

لکھوا نے بے دھیانی یا نشے کی ترنگ میں پوچھ لیا کہ کیوں بھیا، کیوں نہیں رہا؟ جس کا تفنگچے والے نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اپنی رو میں چالیس پرگنے، اڑیسہ راج کے نیچ قوموں کو گالی دے کے بولا، ''انہی کم جاتوں کی وجے سے ٹھاکری کا مجا کھراب ہو گیا ئے۔ ادھر جسے دیکھو راجا ٹوڈر مل بنا گھومتا ہے۔''

گوز مارنے والے نے ہاں میں سر ہلایا اور بنا پوچھے بتانے لگا کہ ہم تو اپنا کھیت کھلیان باڑی بیچ باچ کے سیر سپاٹے کو نکلے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ، گھوم پھر کے سورت کی اور چلے جاویں گے۔ وہاں دو چار جہاز کسوا کے گوروں عربستانیوں کی طرحے سے کوٹھی کھول کے بیٹھیں گے، مال بنائیں گے۔

منگو چمر قصاب نے سن کے سر ہلایا، جھلس کے دل ہی دل میں کہا، ''بھوتنی کے! تمھاری سکل کوٹھی کھولنے والوں جیسی تو ہے نا؟ بڑی بات ہو گی جو ادھری چمڑا پکانے، زین ساج بنانے جیسا کار کھانا چلا پاؤ گے۔''

دارو کا کلہڑ سامنے دھرے، منگو چمر قصاب، مرے ہوئے جانوروں کا چام اتارنے، کمانے والا

کاریگر، لکھوا کے مہمانوں کے لیے اپنی پسند کا کام سوچے بیٹھا تھا، ان کی خوشحالی میں اپنا حصہ نکالنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ''اور کیا، یہ سورے بدجات جبی ادھر کارکھانہ کھولیں گے تو ہم ائی ان کا چام چمڑا سنبھالیں گے، اور کون سنبھالے گا؟''

مہمانوں میں سے وہ جس کے بدنما چہرے پر ٹھاکروں جیسی مانگ دار ڈاڑھی تھی، ایک ہی روز پہلے کسی سے سن کے بیٹھا تھا کہ یہ منگوا چمر قصاب اس کے کام کا آدمی ہے۔ اس کی پہنچ آسانی سے ہاتھ آنے والی عورتوں تک برابر ہے۔ خبر نہیں آپ ہی عورت باز ہے کہ دلالی کرتا ہے۔ چلو دیکھتے ہیں۔ یہ سوچ کے بدصورت ٹھاکر اپنی جگہ چھوڑ کے اٹھا اور منگو کے پاس آن بیٹھا۔ وہ سوچتا ہوا آیا تھا کہ اس منگوا سے اپنے دل کے اجڑے پن کی بپت سنا کے مطلب کی بات کہہ دے گا۔ اچھا ہے دو چار دفعے کی دل لگی رہے گی۔

بدصورت نے تانبے کے دو پیسے نکال کے دینو حمال کی طرف بڑھائے۔ ''لے میاں! تو ادھر پرے کو جا کے بیٹھ اور اپنا کچھ کھا پی۔ ہم دو کو اپنی بات کرنے دے۔''

منگوا تو اس ٹھاکر کے آتے خوش ہو گیا تھا۔ پر دینوا سے پیسے بڑھاتے دیکھ کے کھنکھارا اور بنائی ہوئی بھاری آواز میں بولا، ''ٹھاکر! پیسے اپنی انٹی میں رکھ... میرا ادھر بیٹھنا تجھے برا لگتا ہے تو لے میں ادھر سے ٹل جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کے دینو میاں اٹھا اور دور جا بیٹھا۔

دینو کے جاتے ہی منگو خوشامد میں اس بری صورت والے کے قریب کھسک آیا، دونوں ہاتھ جوڑ کے اس نے ماتھے سے لگائے اور دانت نکال کے ٹھاکر کے قدموں کی طرف جھکتا ہوا بولا، ''ہجور ٹھاکر صاب! بندہ پربر! مسنت آلی!'' یہ شیر شاہی خطاب ''مسندِ عالی'' کی شامت تھی۔ منگو ڈھول مڑھنا جانتا تھا۔ اس نے چھ آٹھ مہینے سرکاری ڈونڈی پیٹنے والوں کے ساتھ کڑ دھم کڑ دھم کر کے نگاڑا پیٹا تھا۔ وہ اعلانچی کے آگے آگے کڑ دھم کرتا چلتا تھا اور جب اعلان ہو چکتا کہ ملک سرکاروں کی سرکار پروردگار پرم آتما کا! حکومت سلطانِ عادل شیر شاہ سوری سمراٹ کی، ولایت مسندِ عالی حاکم مالوہ شجاعت خان کی... اعلان کیا جاتا ہے کہ... فلاں بات اس طرح ہے۔ کڑ دھم کڑ دھم کڑ دھم۔ تو اسی زمانے میں اس نے یہ حضورِ عالی، بندہ پرور، مسند عالی سیکھ لیے تھے۔

وہ ٹھاکر کے بالکل قدموں میں گھس کے بولا، ''میں آپ کا داس، گلام اپنے گلام۔ آپ حکم کرو سرکار۔'' اسے نئے آدمی کے آگے بچھے جانے میں لطف آ رہا تھا۔

ٹھاکر بولا، ''ہو ہو، کریں گے حکم کریں گے مگر ادھر نہیں۔ اکیلے میں بات ہونی چہیے۔''

''جو آدیش، آلی جا! آؤ۔ چلو۔''

لکھوا کا مہمان ٹھاکر خوب نشے میں تھا، پھر بھی سنبھل کے پاؤں دھرتا اور منگوا کو سنبھال سنبھال کے چلاتا ہوا وہ بھٹی کے پچھواڑے آیا۔ یہاں دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تو اس نے انٹی سے ایک روپیا نکالا، گیارہ بارہ تاریخ کی اجلی چاندنی میں منگو کو روپے کے درشن کرائے اور اپنے دل کی بات کہہ دی۔

منگو روپیا دیکھ کے ہنسا، پھر ٹھاکر مہودے کی بات سن سمجھ کے اس کی سٹی گم ہو گئی۔ نشے نے بہرحال اتنا حوصلہ دیا کہ سوکھے حلق سے پھر ہنسی جیسی آواز نکال کے بولا، ''ٹھاکر! ٹھاکر آلی جا! روپیا کا ہے نکالتے ہو؟ رکھ لو، اسے کھلی ہوا میں نہیں لاتے۔ اچھا ہی ہوا جو آپ نے اپنے گلام کو یہ بات اُدھر مافل میں نہیں کہہ دی۔''

''کا ہے؟ ایسی کا بات ہے؟''

''الجھن پڑ جاتی... لو بتاتا ہوں...''

پھر منگو نے بتایا کہ آپ جیسا کہہ رہے ہو ویسی عورتوں کا، ان کی نگرانی، دلالی کرنے والوں کا یہ یہ ہو چکا ہے اور وہ یا تو مالوہ راج چھوڑ کے، ادھر گجرات میں کہ خاندیش سے بھی پرے دریا چھور مطلب سمندر، دریائے شور کی طرف نکل لیے ہیں یا ادھر ہی حرام گردی چھوڑ کے محنت مجوری پہ لگ گئے ہیں۔

''نئے بندوبس میں آلی جا! یہ سب نہیں چل رہا تھا تو اب ایسا ایسا ہوا ہے۔''

منگو کا مہمان یا تو خوب ہی نشے میں تھا یا بالکل بے عقل تھا، سننا ہی نہیں چاہتا تھا، کہنے لگا کہ ابھی میرا کام نکال دو، چھ آٹھ روز میں اتنے پیسے دوں گا کہ کبھی ایک جگے دیکھے نہیں ہوں گے۔ منگو بولا کہ آپ سمجھ نہیں رہے ہو بندہ پر ور۔

ٹھاکر نے بات کاٹ کے بتایا کہ ہمارے پاس بڑا مال آنے والا ہے۔ بہت دیں گے تجھے۔

منگو نے کہا، ''ادھر مانڈو میں ابھی برابر مجوری ملتی ہے۔ آپ کا مال منگو کو نہیں چہیے۔''

ٹھاکر بولا، ''ابے تجھے پتا ہی نہیں ہے ہم کیا کرنے والے ہیں۔ ابھی میرا کام نکال دے۔ آگے ہم تجھے اپنے دھندے میں ملا لیں گے۔ سونے کی مندریاں، کنٹھے پہنے گا کان میں گلے میں۔ اب تک کیا کمائی کی ہوگی تو نے۔ سوری کے! بھول جائے گا سب۔''

پھر وہ منگو کا ہاتھ پکڑ کے بولا کہ آ میرے ساتھ۔ ذرا دیکھ ہم کیا کرتے ہیں، کیا کرنے والے ہیں، کیا کر کے بیٹھے ہیں۔

چمر قصاب بے عقل نہیں تھا۔ وہ سمجھا کوئی پیارا کارخانے کا ہی پھیلا کے بیٹھے ہوں گے، یا کوئی اور اچھی بات ہوگی۔ چلو، اس کے ساتھ جا کے دیکھ لینے میں کوئی نقصان نہیں۔

دونوں لڑکھڑاتے ٹھوکر کھاتے، کمہار محلے کے ایک بڑے احاطے میں آئے، جسے چاروں طرف سے گارے اینٹ سے بنی کوٹھریوں کوٹھوں نے گھیر رکھا تھا۔ منگو پہلے نہیں پہچان پایا پھر سمجھ گیا کہ یہ لکھوا چودھری کی باکھل ہے۔ بیچ کے میدان میں جگہ جگہ کمہار گیری کے چاک، اور چھنی مٹی کی ڈھیریاں لگی تھیں۔ کہیں شام کی گوندھی ہوئی مٹی گھیروں میں پڑی بھیگتی تھی۔ بنے، ادھ بنے برتن بھانڈوں کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ خشت سازوں کے بھٹے سبھی شہر سے باہر لگائے گئے تھے۔ لیکن کیونکہ لکھوا کے گھر والے چودھریوں کا کٹم تھے اس لیے چھوٹا موٹا سفال سازی کا کام یہیں باکھل میں کر لیتے تھے۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

ایک کوٹھری کے آگے، چارپائی پہ بیٹھا، موٹا مسٹنڈا آدمی، برچھی کی ٹیک لگائے، آدھا سویا آدھا جاگا چوکیداری کرتا تھا۔ مانگ دار ڈاڑھی والے کو دیکھ کے اس نے ہاتھ جوڑ کے سلام کیا اور ''سب کھیم کشل'' کہہ کے وہاں سے ٹل گیا۔ بدصورت نے کمر سے چابی نکال، دروازے کی تالا پڑی زنجیر کھول کے نیچے ڈالی اور منگو کو لے کوٹھری میں داخل ہو گیا۔

چراغ کی دھندلی روشنی میں منگو نے دیکھا کہ فرش پر پیال بچھی تھی۔ پیال پہ چار کہ پانچ گٹھریاں پڑی تھیں۔ نقلی ٹھاکر لہرا کے بولا، ''ادھر سے آتے ہوئے چھوٹی عمر کے یہ لڑکا لڑکی کھرید کے لیتے آئے ہیں۔ تو ابھی لکھوا چودھری سے بلکل جکر نہیں کرنا۔ کوئی سوچ سمج لیں، پیچھے بجار

دکھائے دیں گے۔"

منگو کی آنکھیں جیسے حلقوں سے نکل پڑیں۔

برابر کھڑا بدصورت اسے نہیں دیکھتا تھا۔ اس نے ایک گٹھری کو پیر سے ٹھیل کے سیدھا کیا تھا۔ منگو نے دیکھا، چیتھڑوں میں لپٹی، سات آٹھ برس کی ایک لڑکی جاگ پڑی اور منہ پہ ہاتھ رکھ کے بسورنے لگی۔

مانگ دار ڈاڑھی والے نے کمر سے نیام کی ہوئی کٹار نکال لی اور لڑکی کو دکھا کے چپ کا اشارہ کرنے لگا۔ لڑکی چپ ہوگئی اور منہ میں مٹھیاں بھر کے سسکنے لگی۔

پاس سویا ہوا نو دس برس کا ایک لڑکا کروٹ لے کے اٹھنے کو ہوا تو بدصورت مہمان نے اسے ہلکی سی ٹھوکر ماری اور منہ پھیر لینے کا اشارہ کیا۔

باقی دو گٹھریاں ابھی تک بے خبر پڑی تھیں۔

نقلی ٹھاکر نے چراغ قریب کر کے ایک کی صورت دکھائی۔ بہت ہوئی تو یہ لڑکی آٹھ دس برس کی ہوگی۔ ایک جو ابھی سوتی تھی وہ اس سے بھی کم عمر تھی۔

منگو چرقصاب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا... کیا کرے، کہاں جائے؟ اس نے تھوک نگلا، سامنے پیال پہ پڑے بچوں کو دیکھا، برابر کھڑے بدصورت کو دیکھا اور ہلکے ہلکے کانپنے لگا، "ری مائے جانکی! ہے ری میا... رچھیا کرو!" لگتا تھا منگو ابس کھڑے سے گر جائے گا۔

پیال پہ پڑا لڑکا کراہنے لگا تھا، "کیا پتا یہ ابھاگا زخمی بھی ہو؟... آں؟ اب کیا ہوگا مالک؟"

مانگ دار ڈاڑھی والے نے لڑکے پہ چادر ڈال دی، چراغ چبوترے پہ رکھا، منگو کا ہاتھ پکڑ اسے باہر لے آیا۔ کوٹھری میں تالا ڈال دیا۔

باہر کی ہوا میں منگو کو کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے آنکھیں مچ مچا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گہری سانس لی۔ وہ باکھل سے باہر نکلنے کا رستہ ڈھونڈھ رہا تھا۔

اسے دور زمین پہ اکڑوں بیٹھا برچھی والا دکھائی دیا۔ وہ برچھی کی ٹیک لگائے بہت آگے تک جھک گیا تھا، "سو رہا ہے حرام کا۔" منگو کو ہمت ہوئی۔ باکھل سے نکلنے کا رستہ دکھائی دینے لگا۔ نقلی

ٹھاکر نے پاس آ کے کندھا چھوا تو وہ "ہیہہ!" کر کے چک گیا۔

ٹھاکر بولا، "تو ایسا ہے بھیا! ادھر مانڈو میں کوئی کدردان ملے گا تو سودا کری دیں گے سسروں کا۔ تو آج میرا کام کر دے، اتا مال دوں گا کہ جی کھش کر دوں گا۔"

منگو نے کھنکھار کے خود کو حوصلہ دیا۔ اس منحوس شکل "آلی جا" کی طرف دیکھا اور کچھ پھنستی، کچھ کھلتی ہوئی آواز میں کہنے لگا، "ٹھاکر صاب مہودے! آپ غلط جگے تسریف لائے ہو۔ یہ سجات کھان کا مانڈونگر ہے۔ سبیرے سے پہلے ہی نکل لو، میری ناں سنی تو مارے جاؤ گے۔"

یہ کہتے ہی منگو قصاب، حد درجہ دہشت سے حوصلہ پا کے ڈپٹ لیا۔

اس سے پہلے کہ وہ سالا "آلی جا" سمجھ سکتا یا برچھی والا اپنی اونگھ سے باہر آتا، بجلی سا لپکتا منگو چرقصاب، لکھوا چودھری کی باکھل سے نکلتا باہر کی گلیوں گلیاروں میں غائب ہوگیا۔

مالوے کے صدر مقام مانڈو کی کسی عمارت کی باقیات سے ایک رقعہ فرمان آثارِ قدیمہ کے ماہروں کے ہاتھ لگا ہے۔ عمارت کے بارے میں خیال ہے کہ وہ ایک مدت سوری دور کے شعبۂ انصاف کے زیرِ استعمال رہی تھی۔ رقعہ فرمان پر فارسی اور ناگری خط میں علاقہ چالیس پرگنہ کے بعض جرائم پیشہ نواردوں کی دار و گیر کا احوال درج ہے جو مانڈو سے گزرتے ہوئے گرفت میں آئے اور سزا کو پہنچے۔

رقعے کا متن مرورِ وقت سے اس درجہ دھندلا گیا ہے کہ بمشکل پڑھا جاتا ہے۔ تاہم اتنا ضرور سمجھ لیا گیا ہے کہ مجرموں کی دار و گیر میں مانڈونگر کے منگل رام نامی چرم ساز نے اور ہمسائے دینو میاں حمال نے محکمۂ انصاف کی اعانت کی، پس وہ دونوں انعام کے مستحق ٹھہرے۔

درج ہے کہ مسمی منگل نے مجرموں کے ٹھکانے کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور دینو حمال نے ان نابکاروں کی موجودگی کی اطلاع اللہ یار کوتوال تک پہنچائی۔

درج ہے کہ منگل رام چرم ساز کو پانچ روپیہ بطور انعام محکمۂ انصاف کی جانب سے عطا کیا گیا۔ پانچ روپیہ انعام مسمی دینو میاں کو بھی عطا ہوا۔ تاہم بعد ازاں دینو حمال کو محکمۂ شرعیہ اسلامیہ، دارالارشاد، مندو کی جانب سے اتنی ہی رقم اس کی شراب خوری کا احوال جاننے کے بعد جرمانہ کی

گئی۔ ملک مالوہ میں سلطانِ عادل کے نائب کی حیثیت میں مسندِ عالی شجاعت خان سوری یہ اپنا فرض
جانتے ہیں کہ مملکت میں رہائش رکھنے والے اہلِ اسلام کو ناروا کاموں سے...
(آگے کا متن پڑھا نہیں جاسکا۔)

اپنے لوگوں سے سُنی ایک شگفتہ کہانی

یہاں اور وہاں، عام طور پر
میں ڈھائی سو برس کا بچھڑا ہوا قبائلی ہوں۔ میرے قبیلے کے بارے میں،
جو legends گردش کرتی رہتی ہیں وہ آج آپ کو سُناتا ہوں۔
اُس کی راج دھانی میں جابسا تھا۔
ہم 'الف' زئیوں کا ایک خیل، عالمگیر بادشاہ کے عہد میں،
ایک دو ریاستیں قائم
مغلوں کی آپا دھاپی کا دور ہم نے جیسے تیسے کاٹا، خود کو اُس آشوب میں زندہ رکھا،
خیر۔ پچاس
کیں، خوش رہے... اور ناخوش بھی۔ کچھ نے بن کے دکھایا (کچھ نہیں بھی بن پائے)
پچپن برس ہوتے ہیں، ہم بہت سے یہاں آگئے۔
سرداروں، دستارداروں سے
جو یہاں آگئے وہ اپنے بچھڑے ہوئے عزیز پیاروں سے ملے۔
بغل گیر ہوئے۔ بسم اللہ! ماشاءاللہ! کینا! کینا! بیٹھو بیٹھو۔
کشادہ دل... پس ایک دو روز
جیسا سنتے آئے تھے اُنھیں ویسا ہی پایا۔ سیر چشم، کشادہ جبیں،
اُن کے حجروں کی مہمان داری میں آسودہ ہوئے۔
ایک دو روز تو مجھ کہانی سننے والے نے اپنے اندر کے داستان پسند، بے چین آدمی کو سمجھا بجھا
کے رکھا تھا مگر اب جو وہ بے صبرا ہونے لگا تو میں نے میزبانوں، بزرگوں کے گوش گزار کی کہ یارا
میزبانا! کوئی قصہ سناؤ۔ اپنا نہیں تو میرے بڑوں کا ہی کچھ 'احوال جیسا' سنا ڈالو۔

میزبان بزرگ پہلے ہنسا، پھر کہنے لگا کہ تم 'الف' زئیوں کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ تم اتنے کوئی غصہ ور نہیں ہو، تمھیں مُنہ پھٹ اور مصلحت نا اندیش بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایک اعتبار سے polished لوگ ہو۔ تو 'الف' زئیوں کی معاملہ فہمی اور فراست کا ایک مزے کا قصہ یہاں قبائل میں سفر کرتا آ رہا ہے۔ کہتے ہو تو سنا دیتا ہوں۔ میں نے کہا، بسم اللہ! میزبان نے کہانی سنانی شروع کی:

کہنے لگا، ''ہوا یوں کہ نہ معلوم کتنے برس پیچھے 'ج' زئیوں کے کسی جوان نے کسی 'با' زئی جوان کو طیش میں آ کے گولی ماردی۔ 'با' زئی اس زمانے میں علاقے میں تعداد میں کم تھے۔ تاہم ان کے دوست قبائل نے، جو 'ج' زئیوں سے خار کھاتے تھے، مورچے سنبھال لیے اور مطالبہ کیا کہ قاتل کو ہمارے حوالے کرو۔ معاذ اللہ! عجب صورت حالات پیدا ہوگئی...

''مطالبے کے جواب میں 'جیم' زئی بولے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!... اگر بئی! صرف 'با' زئی مطالبہ کر رہے ہوتے تو ہم اور وہ بیٹھتے، جرگہ کرتے اور 'با' زئیوں کی تالیفِ قلب کے لیے لڑکے کے کٹم سے کچھ رقم لے کر، کچھ اپنی طرف سے ملا کر، معاملہ رفع دفع کر دیتے۔ یا بئی! اگر متاثرہ پارٹی کا مطالبہ ہوتا تو اس لڑکے (گدھے) کو جس نے یہ ناسمجھی کی ہے سال دو سال کے لیے 'تڑی پار' کر دیتے۔ لیکن یہ دوسرے لوگ (خبیث) کیوں کود پڑے؟ ان کا اس قضیے سے کیا تعلق؟... ایں؟

''تو یارا! معاملہ گمبھیر ہوتا چلا گیا۔ شاید کسی بڑے جرگے وغیرہ سے رجوع کرنا پڑا... یا نہ بھی رجوع کیا ہو... تو آخر آخر سب سے معاملہ فہم، لکھے پڑھے، سنجیدہ ہمسایوں، یعنی تم 'الف' زئیوں کو بلایا، کہا گیا کہ اپنے آدمیوں میں سے کوئی ثالث مقرر کرو۔ ایک نسبتاً جوان آدمی کو ثالث مقرر کیا گیا جو بہت ہوا تو تیس بتیس سال کا ہوگا۔

''سوال اٹھا کہ 'الف' زئیوں میں بڑے بوڑھے موجود ہیں تو یہ 'لڑکا' یہاں ثالث کے موڑھے پہ کیوں آن بیٹھا ہے؟ سردارِ قبیلہ نے کہا کہ یارا! لڑکے کے فیصلے سے قبائل کی تشفی نہ ہوئی تو میں سب بزرگوں، دستارداروں سے معافی مانگ لوں گا اور یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔ اللہ بڑا مُسبّبُ الاسباب ہے۔

''سب طرف کی شہادتیں گزاری گئیں، پنچوں نے اپنی observations ثالث کے گوش گزار کیں۔ ثالث بہت دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا پھر اس نے فیصلہ دیا کہ 'با' زئی جوان جو مارا گیا بے شک بے بدل جوان تھا۔ ویسے تو آدمی کی جان کا بدلہ جان ہی ہونا چاہیے کہ انصاف کا تقاضا یہی ہے... لیکن کیا ایسا نہیں ہے کہ 'با' زئی دوست کی طرف سے بھی زیادتی جیسی ہوئی تھی؟ میں اگر اس کی جگہ ہوتا تو معذرت کر کے اپنے گھر لوٹ گیا ہوتا۔ پھر کیا جھگڑا، کیسا فساد؟ مگر میرا 'با' زئی دوست دلاوروں کا دلاور تھا، ڈٹا رہا۔ 'جیم' زئی کسی سے کم نہیں ہوتے، میرا یہ دوست بھی کاہے کو پیچھے ہٹتا۔ خیر، دونوں کے نصیب کا لکھا سامنے آیا۔ اب یہ ہے کہ 'جیم' زئی دوست ہمارے 'با' زئی بھائیوں کو ایک سو اس... مطلب سو عدد بکریاں تاوان کی ادا کریں۔ یہ ثالث کا فیصلہ ہے۔ یہاں وہ جوان لمحے بھر کو رکا، پھر کھنکارا، اِدھر اُدھر دیکھ کے بولا... لیکن کیوں کہ 'جیم' زئی بھی بے شک ہمارے بھائی بند ہیں... یہاں میرے بڑے بیٹھے ہیں، یہ تصدیق کریں گے کہ ہم 'الف' زئیوں پر فلاں 'جیم' زئی بزرگ نے کبھی کوئی احسان کیا تھا، اس کو چکتا کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ اس لیے میں اپنے ذاتی ریوڑ کی ایک سو بکریاں 'جیم' زئی دوستوں کی طرف سے 'با' زئیوں کو دیتا ہوں۔

''یہ کہہ کے وہ جوان اپنے باڑے سے سو بکریاں کھول کر 'با' زئیوں کے باڑے میں باندھنے کو چلا۔

''اب ادھر کی سنیے! 'الف' زئی اپنے گھروں کو لوٹتے تھے کہ ایک چھوٹے بچّے نے سردار قبیلہ سے کہا کہ او بزرگا! یہ کیسا ثالث ہے؟ اور یہ فیصلہ کس طرح کا ہے کہ باڑے سے اپنی ایک سو بکریاں کم ہو گئیں؟

''بزرگ نے مسکرا کے کہا کہ بچّے! تو نہ ثالث کو جانتا ہے نہ 'جیم' زئیوں کو۔ اُنھیں خوب پتا ہے کہ ثالث نے جو ہم پر اُن کے کسی احسان کا ذکر کیا ہے، وہ نری بکواس ہے۔ نہ 'جیم' کسی پہ احسان کرتے ہیں، نہ ہی ہم اُن چھچھوروں کا احسان لیتے ہیں۔ تُو دیکھتا جا کیا ہوتا ہے۔

''گھنٹے سوا گھنٹے بعد ثالث بھائی واپس آیا تو اُس کے پیچھے سو کی جگہ ایک سو سات بکریاں تھیں۔ حیرت! حیرت!

''بزرگ نے بچے سے کہا، جا انھیں گن۔ بچہ گن کر آیا، پوری ایک سو سات! تب بزرگ نے کہا، سُن اس سوا گھنٹے میں جو ہوا ہوگا مجھ سے سن لے۔ اپنا ثالث بکریاں لے کر 'با' زئیوں کی طرف جاتا ہوگا تو اُسے راہ میں 'جیم' لوگوں کے بزرگ ملے ہوں گے۔ انھوں نے ہمارے لڑکے کے فہم کی

تعریف کی ہوگی۔اسے گلے سے لگا کر اس کی کشادہ دلی کی ثنا کی ہوگی، پھر کہا ہوگا کہ یارا! پرکھوں کا آپس کا جو احسان تھا وہ ہماری تمھاری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔اُسے بھول جانا ہی بہتر ہے۔ ہاں، تم نے بھائی بندی میں یہ جو قدم اُٹھایا ہے ہمیں تو اس نے جیت لیا ہے۔ سمجھے؟ یہ اپنی بکریاں واپس لے جاؤ۔ تمھارے بڑوں کی اور تمھاری دعا سے 'جیم' زئیوں کے باڑے بھرے ہوئے ہیں۔ جو بھی تاوان مقرر کیا گیا ہے وہ ہم خود ادا کریں گے۔

''پھر انھوں نے قبائلی روایت کی پاسداری میں اور 'الف' زئیوں کے مہر و مروّت کو سراہتے ہوئے اپنی طرف سے سات بکریاں اسے نذر کی ہوں گی۔ تو اس طرح اپنی سو کی ایک سو سات ہو گئیں۔ سمجھا بئ!؟

''پھر بزرگ نے اُس قضیے کے ثالث سے پوچھا، 'کیوں بئ! یہی ہوا تھا؟'

''ثالث نے بے حد خوش ہو کے دانت نکال دیے، عرض کی، 'ہاں بزرگا! عین مین ایسا ہی ہوا تھا۔'''

عون محمد وکیل، بے بے اور کا کا

میں وکیل عون محمد ہوں۔ وکالت نامے پہ پندرہ سالہ موکل کے دستخط لے کر اس وقت اپنے دفتر جا رہا ہوں۔ ملزم، مسمّی کا کے کی والدہ بھی بچوں کی جیل تک میرے ساتھ میری گاڑی میں آئی تھی۔ وہ اسے بے بے کہہ کے پکارتا ہے اور اسے بہت پیار کرتا ہے۔

کاغذات کی تکمیل کے بعد بے بے کلفٹن کی بس پکڑنے چل دی۔ اسے عبداللہ شاہ غازی کی درگاہ پہ پہنچنا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ بے بے! بیٹھی رہ بیٹھی رہ (لوگوں کو میرا اسے بے بے کہہ کے پکارنا عجیب لگتا ہوگا کیوں کہ وہ ابھی صرف بتیس سال کی ہے، جب کہ میرا اپنا چھوٹا بیٹا سینتیسویں سال میں ہے) خیر میں نے کہا بیٹھی رہ بے بے! میں تجھے درگاہ چھوڑتا ہوا نکل جاؤں گا، مگر وہ نہیں مانی۔ کہنے لگی میں چلی جاؤں گی۔ آپ میری وجہ سے ٹائم خراب مت کرو، کا کے کے کیس پہ کام شروع کر دو۔ بہت وقت نکل گیا ہے ادھر جیل میں میرے کا کے کو پانچواں دن لگا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔

اصل میں پولیس نے کا کے کے خلاف blasphemy کا کیس درج کیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ لوگ اسے جان سے نہ مار دیں۔

(بے بے کو ابھی یہ بات میں نے نہیں بتائی ہے۔)

ہوا یہ تھا کہ کاکے نے محلے کے پیش امام کی جلتی ہوئی لالٹین پہ غلیل میں پتھر رکھ کے مار دیا تھا تو حجرے میں آگ پھیل گئی تھی جس سے پیش امام کی نئی واسکٹ، ایک پیلا سفید رومال اور کچھ برکتوں والے کاغذ ضائع ہو گئے تھے جن پر رحمتوں والا پاک کلام چھپا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بے حرمتی کا پرچہ کٹوانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آخر کو سچ سامنے آئے گا اور کاکا بری ہو جائے گا۔

عین ممکن ہے خود پیش امام پر (جس کا نام سراج دین ہے) بے حرمتی کا جرم ثابت ہو جائے۔

کوشش میری یہی ہے کہ سچ سامنے آئے۔ خالص اور پورا سچ۔

بے بے اور کاکے نے اپنے بارے میں اور پیش امام کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، لیجیے، وہ میں شروع سے سناتا ہوں:

بے بے بہت دنوں کی بیوہ ہے۔ وہ زیادہ نہیں بولتی اور نماز کی پابندی کرتی ہے۔

اپنے کاکے کے ساتھ کسی گاؤں سے آ کے وہ یہاں غیر مسلموں کے کسی گرلز اسکول میں چپراسن لگ گئی اور محنت اور ایمانداری سے کام کرنے لگی۔ وہیں اسکول والوں نے اسے اپنی کینٹین کا ٹھیکا بھی دے دیا۔ لو جی، اس کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ اسکول والوں نے چار پانچ برس میں اس کی درخواست منظور کر لی اور اسے یہ اجازت دے دی کہ وہ اسکول اسٹاف کے علاوہ بھی گنتی کے لوگوں کے لیے اپنے گھر سے صاف ستھرا کھانا بنا کر لا سکتی ہے، جسے وہ لوگ لنچ کے وقفے میں کینٹین کے باہری گیٹ پر آ کر لے جا سکتے ہیں۔

پھر اسے کہا گیا کہ وہ گیٹ کی اوٹ میں خالی جگہ میں اپنے لیے عارضی اسٹور جیسا بنا لے، جس کا ایک ہی دروازہ ہونا چاہیے۔ باہر کی طرف۔

یہاں وہ اپنے بیٹے اور کینٹین کے ملازم لڑکے کو بٹھا کے دوپہر میں کھانا کھلا سکتی ہے۔ پھر تو بے بے خود بھی یہیں کھانا کھانے لگی۔

اب جو اس کی آمدنی اور بڑھی تو اس نے کچی آبادی میں 80 مربع گز کا ایک پلاٹ خرید لیا اور دو کمروں کا مکان بنا لیا۔ پھر بجلی لگوالی اور ایک کنواں کھدوالیا۔ کنویں میں اس کے نصیب سے میٹھا پانی نکل آیا تو اس نے پمپ لگوالیا اور گھر کی دیوار سے ملا کے ایک چھوٹی ٹنکی بنوادی جس میں وہ محلے والوں کے لیے پانی اسٹور کرنے لگی۔ صبح جب بے بے کے گھر کا پمپ چل رہا ہوتا تو دو چار محلے والے سویرے کے تازہ پانی سے اپنی بالٹیاں بھر بھر کے لے جانے لگے۔ باقی پڑوسیوں کی دن بھر کی ضرورت کے لیے ٹنکی شام تک بھری رہتی۔

اس عرصے میں بے بے کے گھر کے سامنے ایک مسجد بن گئی تھی اور ایک جوان پیش امام کہیں سے آ کے حجرہ بنا کے رہنے لگا تھا۔

پیش امام نے محلے والوں کی ٹنکی دیکھی تو خوش ہو کے اس نے الحمدللہ کہا اور ایک دن ٹھیلے والے نانا کو ساتھ لے کر، اسے ٹیکسی میں بٹھا کے وہ کینٹین کے باہری دروازے تک پہنچ گیا۔

ٹھیلے والے نانا ایک نرم مزاج بڑے میاں تھے جو سستے پھلوں اور سبزیوں کا ٹھیلا لگاتے تھے۔ نانا کا کچا پکا گھروندا بے بے کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ بے بے پیار سے بڑے میاں کو بابا کہتی تھی اور کاکے نے انھیں نانا کہنا سیکھا تھا، اس لیے بڑے میاں سب کے نانا کہلانے لگے۔

نانا نے کینٹین پر آ کے بتایا کہ پیش امام انھیں سفارش کے لیے لایا ہے۔ اگر بے بے باہر کی چھوٹی ٹنکی سے، گلی پار کرا کے، ایک نل مسجد کے وضو خانے تک پہنچا دے گی تو نمازیوں کے لیے طہارت اور وضو کا اچھا انتظام ہو جائے گا اور بے بے کو ثواب ملے گا۔

بے بے نے کہا آپ دونوں نے اتنی دور آنے کی تکلیف کیوں کی۔ وہیں صبح گھر پہ کہہ دیا ہوتا۔ نانا نے بتایا کہ پیش امام وہاں سب لوگوں کے سامنے تم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بے بے نے پوچھا کیوں بھلا؟ پھر خود ہی بولی، چلو، بسم اللہ کرو۔ نیک کام میں اتنے سوال جواب کس لیے۔ آج میں دکان سے پائپ اور دوسری چیزیں لیتی آؤں گی۔ پلمبر سے کہہ دوں گی۔ وہ سویرے آ جائے گا، مسجد تک پائپ پہنچا دے گا۔

نانا نے ٹیکسی میں بیٹھے پیش امام کو یہ سب بتلایا تو وہ کہنے لگا، ”جزاک اللہ! پائپ ہم ابھی ٹیکسی میں لیتے چلے جائیں گے... پلمبر سے بھی کہہ دیں گے۔ بی بی کو بولو پیسے کا بندوبست کر دے۔“

بے بے نے ادھر مہمانوں کے لیے تازہ چائے بنا لی تھی اور اندر اسکول میں کہہ دیا تھا کہ وہ

ربِ لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: +92- 347 8848884

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: +92- 334 0120123

آدھے گھنٹے کے لیے سامان خریدنے نانا کے ساتھ جا رہی ہے۔

کاکے نے نانا اور پیش امام کو چائے کے لیے کینٹین کے اسٹور میں آنے کو کہا تو پیش امام کہنے لگا برخوردار! اگر چائے پلانی ہو تو یہیں گاڑی میں لے آؤ۔ میرا ہوٹل وغیرہ میں بیٹھ کر چائے پینا مناسب نہیں ہوگا۔ کاکے کو حیرت ہوئی، ان کا اسٹور ہوٹل تو نہیں ہے، اگر ہوتا تو بھی کیا برائی تھی... خیر، اس نے دونوں کو اور ٹیکسی والے کو گاڑی میں ہی چائے پلا دی۔

ادھر چھینٹا مار، تولیے سے ہاتھ منہ پونچھ، کنگھے کے دو ہاتھ چلا، بے بے سامان خریدنے کو تیار ہو کر باہر نکل آئی تو پیش امام سوچ میں پڑ گیا۔

نانا نے پوچھا کیا بات ہے، کس سوچ میں ہو؟ پیش امام بولا، بے پردہ مستورات بیٹھ رہی ہیں، میرے لیے موٹر میں ان کے ساتھ بیٹھنا مناسب نہیں ہوگا۔ نانا نے پوچھا، کیوں مناسب نہیں ہوگا؟ پیش امام کہنے لگا، جب آپ نہیں سمجھ رہے تو میرا بیان کرنا بھی نامناسب ہے۔

بے بے کو اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کس کینڈے کا آدمی ہے۔ مگر کیونکہ وہ اچھا کام کرنے نکل رہی تھی اس لیے خود نانا کے ساتھ گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی اور پیش امام ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پہ جا بیٹھا۔

بے بے نے پلمبری کا سامان خریدوا دیا اور وہ دونوں چلے گئے۔

پلمبر نے دل لگا کے کام کیا اور اگلے دن عشا کے بعد مسجد کے وضو خانے تک پائپ پہنچا دیا۔

اس دن کی نمازیں پڑھی جا چکی تھیں تو پلمبر نے مشورہ دیا کہ کل فجر کے وقت بسم اللہ کر کے پمپ چلا دینا۔ یہ مشورہ یوں بھی صحیح تھا کہ پائپ کو ٹکانے کے لیے اس نے کہیں کہیں سیمنٹ لگائی تھی، وہ بھی رات بھر میں سیٹ ہو جاتی۔

بے بے نے نانا کو پکا کر لیا کہ وہ فجر کے وقت بسم اللہ پڑھ کے اپنے مبارک ہاتھوں سے پمپ چلا دیں گے۔

نانا سیدھے سادے آدمی تھے۔ وہ فجر کی اذان کے بعد بے بے کے صحن میں، جہاں میٹر اور سوئچ لگے تھے، پیش امام کو لے کر آ گئے۔ اس نے پمپ کے لیے لمبی دعا پڑھی اور بسم اللہ کہہ کے سوئچ

کھول دیا۔ پھر کافی دیر تک وہ دیدے گھما گھما کے جائزہ لیتا رہا اور بے بے اور کاکے کے لیے دعائے خیر کرتا رہا۔

دن خوب نکل آیا تو گلی میں موٹر رکشا کی آواز اور بچوں کے نعرے سنائی دیے۔ لوگوں نے نکل کے دیکھا کہ پلمبر پر مٹھائی کا ٹوکرا لدوائے پیش امام کھڑا بے بے کے مکان کی کنڈی بجاتا ہے۔ کاکے نے دروازہ کھولا تو کلکاریاں مارتے ہجوم کو چیر کر بے بے کو پکارتا ہوا پیش امام گھر کے صحن میں آ گیا۔ بہت سے ہمّت والے بچے بھی اس کی ٹانگوں سے لپٹے، اس کے کپڑے کھینچتے ہوئے صحن میں آ گئے تھے۔ پیش امام نے بہت استغفار پڑھی اور خطبے والا عصا (جو وہ فاتحہ پڑھنے کو ساتھ لیتا آیا تھا) گھمایا، مگر صحن میں آ جانے والے بچوں نے باہر جانے سے انکار کر دیا۔ نانا بھی آ گئے۔ پیش امام کو گلی میں نکل کر بچوں کو مٹھائی تقسیم کرنی پڑی۔

بے بے اور کاکے کو بہت سی مٹھائی دینے پیش امام جب دوبارہ گھر میں آ گیا تو بے بے نے نانا سے اور پلمبر اور پیش امام سے کہہ دیا کہ آج اتوار کا دن ہے، اس کی چھٹی ہے۔ وہ سب لوگ دوپہر کو آ جائیں اور کھانا کھا لیں، مہربانی ہوگی۔

بے بے نے دس آدمیوں کا کھانا تیار کیا۔ میٹھا اس نے ایک روز پہلے ایرانی ہوٹل والے کے فریج میں رکھوایا ہوا تھا۔ کیونکہ اسکول کی وجہ سے بے بے اور کاکے کی ہوٹل والے سے جان پہچان ہو گئی تھی تو کینٹین کی ایک دن کی بچی ہوئی چیز وہ فریج میں سنبھال لیا کرتا تھا۔ کھانے کا وقت ہونے لگا تو کاکا فریج میں رکھوایا ہوا میٹھا لینے گیا۔ اس نے ہوٹل کے کاؤنٹر پہ کسی آدمی کے ساتھ پیش امام کو کھڑے دیکھا۔

وہ دونوں آدمی پیسے ادا کرنے کے لیے ایک دوسرے سے تکلف کا جھنجھٹ کر رہے تھے، ہوٹل کا مالک میز پر اپنے ہاتھ رکھے بڑی بیزاری سے دونوں کو یہ سب کرتے دیکھ رہا تھا۔ کاکے نے اسے سلام کیا اور دور سے فریج کی طرف اشارہ کیا تو اس نے سر ہلا دیا کہ نکال لو۔

لمحے بھر کو پیش امام کا دھیان بٹ گیا، اس نے کاکے کو فریج سے میٹھے کا پیکٹ نکالتے دیکھا۔ اسی وقت مہمان نے کاؤنٹر پر پیسے رکھ دیے اور وہ جیت گیا۔ پیش امام کھسیا گیا۔ اس نے دو روز پہلے ہی تو

کاکے سے کہا تھا کہ اس کا ہوٹل میں چائے وغیرہ پینا مناسب نہیں ہے۔

دوپہر کے کھانے پر جب سب لوگ کھانے پر بیٹھنے لگے تو پیش امام نے شانوں پر سے کڑھا ہوا سفید رومال اتار کر اپنے برابر کی جگہ کو اس طرح جھاڑا جیسے گرد جھاڑتا ہو پھر کہنے لگا، ''آؤ برخوردار! یہاں میرے پاس بیٹھو۔'' ظاہر ہے کاکا اندر سے کھانا لا لا کر مہمانوں کے آگے رکھ رہا تھا، بیٹھ کیسے سکتا تھا۔ بے بے نے کھانے کے بعد چائے پلائی پھر وہ اندر بیٹھی عورتوں سے معذرت کر کے دروازے تک مردوں کو رخصت کرنے آئی۔ پیش امام نے اپنے پیلے سفید رومال کو گھونگھٹ کی طرح سر پر ڈال رکھا تھا۔ تو اس نے گھر کی دہلیز پار کرنے سے پہلے پھر دعا پڑھی اور دیر تک رقت کے ساتھ مناجات کرتا رہا۔ اس نے بے بے کی خدا ترسی، نیک نفسی اور پرہیزگاری کا بیان کرتے ہوئے اس کے لیے اجرِ عظیم کی سفارش کی، کس لیے کہ بے بے نے اپنے ٹیوب ویل، موٹر اور پمپ سے نمازیوں کے اور خلقِ خدا کے لیے پانی فراہم کر دیا تھا۔ آمین کہہ کر اور مرد تو رخصت ہوئے مگر پیش امام رہ گیا جو باہر کی ٹنکی کے ہر پہلو کی جانچ پڑتال کرتا جاتا تھا اور ٹونٹیوں کو گھما گھما کے خدا کی بزرگی بیان کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے بے بے سے جانے کی اجازت چاہی، جو فوراً ہی مل گئی۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بے بے کو مشورہ دیا کہ اب جبکہ اس کی اور اس گھرانے کی جان پہچان ہو گئی ہے تو یہ بہتر ہو گا کہ کاکا، پیش امام سے سیپارہ پڑھنا شروع کر دے۔ بے بے نے کہا سبحان اللہ! اس سے اچھی بات کیا ہو گی، وہ کاکے کو بھیج دیا کرے گی۔ پیش امام کہنے لگا، وہ خود آ جایا کرے گا اس لیے کہ کہا گیا ہے کہ نیک کام سرانجام دینے کے لیے ایک قدم بھی اٹھایا جائے تو اس پر اتنا اتنا ثواب ہوتا ہے۔ بے بے نے کہا کہ آپ کیوں زحمت کریں، کاکا ہی آ جایا کرے گا اور وہ سلام کر کے اندر چلی آئی۔

دوسرے دن سے کاکے نے پیش امام سے سیپارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مگر ابھی پڑھنے کا وقت ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ کاکا کبھی تو فجر کی نماز کے بعد آدھے گھنٹے کے لیے مسجد ہی میں بیٹھ کر سبق لیتا اور سنا دیتا تھا، کبھی مغرب کے بعد۔ لیکن یہ دونوں وقت بہت تنگ تھے کیونکہ صبح دونوں ماں بیٹے کو کینٹین کھولنے کی جلدی ہوتی تھی اور شام میں کاکا بہت تھکا ہوا ہوتا تھا تو مغرب کے بعد اسے نیند کے جھونکے آتے تھے۔ کچھ دن سیپارے کی پڑھائی صبح اور شام، وقت بدل بدل کے ہوئی پھر یہ گنڈے دار ہونے لگی۔ پیش امام نے تجویز پیش کی کہ کاکے کو دن میں ضرور وقت ملتا ہو گا تو کیوں نہ پیش امام کینٹین پر آ جایا کرے۔ سنا ہے اسٹور میں کچھ جگہ ہے، بس وہاں ایک طرف بیٹھ کے کاکا سبق لے لیا کرے گا۔ اس وقت بھی اس نے نیک کام سرانجام دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ دور جانے کی فضیلت بیان کی اور فاصلے کو ثواب کے لحاظ سے مفید بتایا۔ تجویز اچھی تھی، مگر بے بے نے سوچا ہماری وجہ سے بیچارہ چل کر یا بس سے اتنی دور آئے گا اس لیے اس نے جواب میں پیشکش کی کہ دوپہر کا کھانا پیش امام کینٹین ہی میں کھا لیا کرے اس لیے کہ وقت کھانے کا ہو گا اور کاکا اس وقت فارغ بھی ہوتا ہے۔ پیش امام نے پہلے تو تجویز کی مخالفت کی مگر یہ مخالفت ایسی تھی جیسی ایرانی ہوٹل کے کاؤنٹر پر چائے کے پیسے ادا کرنے کے لیے اس کا اور اس کے مہمان کا تکلف بھرا جھنجھٹ۔

پیش امام دوپہر میں کینٹین پر آنے لگا۔ پہلے بے بے، کاکا اور کینٹین والا لڑکا فرصت پاتے ہی اسٹور کی میز پر کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ اب جو پیش امام آنے لگا تو کاکا وہیں ایک طرف بیٹھ کے سبق پڑھ لیتا پھر کاکے اور پیش امام اور لڑکے کے لیے بے بے کھانا لگا دیتی۔ انھیں کھلا کر پیش امام کے جانے کے بعد، وہ خود کھانا کھا لیتی۔

بظاہر سب ٹھیک ٹھاک تھا لیکن پیش امام، باتوں باتوں میں مسلمانوں کے آپس کے انتشار کے وجوہ بیان کرنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مسلمان لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا کریں تو یگانگت بڑھے گی اور اسلامیانِ عالم کو دنیا میں سربلندی نصیب ہو گی۔ بے بے اس کے خیال سے پورا پورا اتفاق کرتی تھی لیکن کھانا وہ پیش امام کے جانے کے بعد ہی کھاتی رہی۔

پیش امام عام طور پر کھانے کے بعد ایک لمبی دعا کرتا اور چائے ضرور پیتا تھا۔ دعا میں خاص طور پر بے بے کی صحت اور اس کی سلامتی طلب کی جاتی۔ مگر پیش امام کا بے بے اور کاکے کی زندگیوں میں اس طور داخل ہونا آخر کار ان کے ذہنی سکون کو درہم برہم کر گیا۔

ایک روز سبق لینے، کھانا کھانے، چائے پینے کے بعد کاکا، پیش امام کو کینٹین کے دروازے تک رخصت کر کے اندر اسٹور میں آنے لگا تو پیش امام بھی پیچھے پیچھے چلا آیا۔ بے بے نے ابھی کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ کاکے اور پیش امام کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔ پیش امام ایک کرسی کھینچ

کر میز سے ذرا دور بیٹھ گیا اور کاکے سے کہنے لگا، ''دیکھو برخوردار! مجھے تمھارے مستقبل کے بارے میں تمھاری والدہ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مناسب ہو گا کہ تم مجھے سکون سے باتیں کرنے دو۔ اس لڑکے کو بھی ادھر نہ آنے دینا۔ جاؤ شاباش۔'' پھر وہ بے بے سے مخاطب ہوا، بولا ''خاتون آپ کچھ دیر بعد کھانا کھا لیجیے۔ کچھ غور طلب معاملات ہیں جن پر بات کر کے میں فوری طور پر جانا چاہتا ہوں۔ جلدی میں ہوں۔''

بیٹے نے ماں کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا۔ ماں نے اشارے سے اسے باہر جانے کو کہہ دیا۔ وہ باہر آ بیٹھا اور سوچنے لگا کہ پیش امام ایسی کون سی بات کہنا چاہتا ہے؟ ہو سکتا ہے میری شکایت کرتا ہو۔ پر میں ٹھیک ٹھاک پڑھ رہا ہوں، روز کا کام روز کرتا ہوں، اور کیا چاہیے؟ خیر، وہ اسی سوچ میں تھا کہ اندر سے بے بے نے اسے آواز دے لی۔ وہ پہنچا تو بے بے منہ پر ہاتھ رکھے شاید رو رہی تھی۔ مگر وہ بولی تو اندازہ ہوا کہ رو نہیں رہی تھی، وہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کاکے کے پہنچتے ہی پیش امام پُرزور انداز میں بے بے سے کہنے لگا، ''خاتون! میں پھر تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ برخوردار کا فی الوقت اس معاملے سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ فوری طور پر اس سے یہ بات کہہ دی جائے۔''

بے بے نے مشکل سے ضبط کر کے کہا، ''حضرت مولانا! آپ کا خیال درست نہیں ہے۔ جو تجویز آپ پیش کر رہے ہیں، اگر میں اس سے اتفاق کر لوں تو آپ اس کاکے کے باپ بن جائیں گے، اس لیے پہلے اس برخوردار سے پوچھ لیا جائے کہ کیا یہ آپ کو اس حیثیت سے قبول بھی کرے گا؟ ...کیوں بیٹے؟''

پیش امام نے کسی کو بولنے کا موقع نہ دیا... تقریباً خفا ہو کے کہنے لگا، ''خاتون! یہ بچہ قبول نہیں کرے گا۔ قبول آپ کریں گی۔ ایجاب و قبول زوجین کے مابین ہوتے ہیں۔''

بچے کی سمجھ میں اب بھی زیادہ کچھ نہیں آیا تھا۔

بے بے کو پیش امام کی بات پر طرارہ آ گیا کہنے لگی کہ ایجاب و قبول طرفین کے مابین ہوتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ میرا بیٹا ہی میرا محرم اور میرے گھر کا واحد مرد ہے تو میں

پہلے اس کی رائے معلوم کروں گی۔ آپ چپ رہیے۔ کیوں بیٹے؟ یہ پیش امام صاحب جنھیں تم اس وقت کرسی پہ بیٹھے دیکھ رہے ہو اگر یہ مستقل، یہاں اس کرسی پر... مطلب، اگر یہ پورے کے پورے ہماری زندگی کا حصہ بن جائیں... تو تمھیں کیسا لگے گا؟ بے بے نے بیٹے سے کچھ مسکراتے کچھ سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی جواب کاکے کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے الجھ کے سوال کیا کہ کیوں؟ بے بے نے مسکرا کے پوچھا، ''کیوں کیا مطلب؟ بھئی یہی کہہ رہے ہیں۔'' کاکے نے اب کے تیز ہو کے پوچھا، ''مگر یہ ہماری زندگی میں کیوں حصہ بتائیں گے؟''

کاکے کے حصہ بتائیں گے، کہنے پر بے بے نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی، پھر ہنسی روک کے بولی، ''اس لیے کہ یہ صاحب مجھے گناہوں سے بچانا چاہتے ہیں — سمجھو جنّتی بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں جو اکیلی رہ کے تمھاری پرورش کر رہی ہوں تو یہ کفرانِ نعمت ہے، جو گناہ ہوتا ہے۔''

کاکے نے پیش امام سے کہا کہ پرورش کرنا گناہ نہیں ہوتا۔

لاحول پڑھتے ہوئے پیش امام بھنّا کے بولا، ''خاتون! ایک بہت اہم مسئلہ آپ نے بچے کو کھلنے کو دے دیا ہے۔ آخر یہ کس قماش کی گفتگو ہے؟''

بے بے نے اب کے پوری طرح سنجیدہ ہو کے کہا، ''یہ ماں بیٹے کی گفتگو ہے۔ آپ کو پسند نہیں ہے تو چلے جائیے۔''

پیش امام کو بہت بُرا لگا۔ وہ اٹھا مگر پھر سنبھل کے بیٹھ گیا اور کاکے سے کہنے لگا کہ جاؤ برخوردار، تم باہر جاؤ۔ کاکے نے الٹ کے کہا، ''کیوں؟''

پیش امام نے اونچے سر میں کہا، ''میں کہہ رہا ہوں باہر جاؤ۔ بچّوں کے سامنے بہت سے مسئلوں پر بات نہیں ہو سکتی۔''

بے بے اب روکھے پن سے بولی، ''سنیے جی مولوی صاحب! میں نے آپ سے جانے کو کہا ہے۔ اب آپ تشریف لے جائیے اور ادھر آنے کی پھر زحمت نہ فرمایئے۔ بس ہو گئی پڑھائی۔ بچّہ کہیں اور پڑھ لے گا۔''

پیش امام نے آنکھیں دکھائیں، کہنے لگا، ''پھر زحمت نہ فرمایئے، کیا مطلب؟ میں اس بچّے کو

کلام اللہ پڑھا رہا ہوں۔"

بے بے کو اس انداز پہ حیرت ہوئی، کہنے لگی، "نہیں اب نہیں پڑھا رہے آپ۔" اس نے پھر آنکھیں دکھائیں، "خاتون! اس کا فیصلہ میں کروں گا!"

بے بے اُٹھ کے کھڑی ہوگئی۔ کاکا اس کے برابر جا کھڑا ہوا۔ کہنے لگی، "تم اپنے حواسوں میں تو ہو؟ میں آخری بار کہہ رہی ہوں کہ اب چلے جاؤ اور یہاں اب نہ آنا۔ سمجھے؟"

پیش امام نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے گہری سانس لی، جیسے خود کو کسی آزمائش کے لیے تیار کر رہا ہو۔ پھر پھنسی ہوئی آواز میں بولا، "عورت تجھے نہیں معلوم کہ تو کن شیطانی اثرات کے تحت ایک دیندار آدمی سے منہ ماری کر رہی ہے۔ اے بدنصیب! میں نے تو تیری اصلاح کے لیے یہ تحریک کی تھی۔ خدا جانتا ہے کہ اس میں نفسی خواہش کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس وقت میں جا رہا ہوں مگر میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔ اے ناقص العقل! میں تو..."

بے بے نے اسے آگے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جس کرسی پر اب تک بیٹھی تھی اس نے اس کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑا اور دانت پیس کر بولی، "جاتا ہے یا دوں ایک!"

"تجھے یہ کرسی اٹھانا مہنگا پڑے گا۔ جہنمی! ملعون!" کہتا ہوا پیش امام اسٹور سے نکل گیا۔

بے بے بہت دیر تک سناٹے میں رہی پھر کاکے سے آہستہ سے کہنے لگی، "یہ مجھے پاگل لگتا ہے۔ بلاوجہ جھک جھک کر کے گیا ہے۔ یہ تجھے کہیں باہر ملے تو بات مت کرنا اور اس جھگڑے کا کسی سے ذکر مت کرنا۔" کاکے نے سر ہلا کر بے بے سے وعدہ کرلیا۔

دو دن کچھ نہیں ہوا۔ پیش امام ایک بار کاکے کو بستی میں نظر آیا۔ اس نے خود ہی نظریں چرالیں۔ کاکے نے بھی سلام نہیں کیا۔ تیسرے دن ایک جوان آدمی بے بے کو کینٹین کے دروازے میں کھڑا دیکھ کر آگے آیا سلام کر کے کہنے لگا، "بی بی! پرسوں جو ہوا تھا، بے شک برا ہوا تھا۔ آپ کچھ خیال نہیں کرنا۔ بھائی سراج دین نے پچھوایا ہے کہ اب تو آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا؟"

کاکا اسے پہچان گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو پیسے دینے کے لیے اس دن پیش امام کے ساتھ جھنجھٹ کر رہا تھا اور بالآخر پیسے دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ بے بے اسے بولتے سن رہی تھی اور

بس گھورے جارہی تھی۔ اس نے جو 'بھائی سراج دین' کہا تو یہ پیش امام کا نام ہوگا۔

لمحے بھر رک کے وہ کہنے لگا، "اصل میں جی وہ بڑا نیک طبیعت آدمی ہے۔ کبھی دنگا فساد نہیں کرتا۔ دیندار بندہ ہے۔ ادھر ملک میں اس کے گھر والوں کا تھوڑا بہت کاروبار ہے، زرعی زمین بھی ہے، نہری... ایک بھائی ہے، چھوٹا۔ والدہ صاحبہ ہے۔ والد صاحب پولیس کا ریٹائرڈ حوالدار ہے۔ اس کی بات کا بُرا مت منانا۔ گرما گرمی میں کچھ کہہ دیا ہوگا... اب اگر آپ فرماؤ تو ادھر سے والدہ صاحبہ کو بلوا بھیجتے ہیں۔ ویسے وہ بہت ضعیف ہوگئی ہے۔ ادھر ہی آپ لوگ بات کر کرا کے طے کرلو۔"

بے بے نے اس کی یہ لمبی بکھری بکھری تقریر بڑے حوصلے سے سنی۔ وہ سانس لینے کو رکا تو اس نے رسان سے پوچھا، "اے بھائی! تمھارا نام کیا ہے؟"

وہ جھینپ کے بولا، "میرا نام بھی سراج دین ہے۔ سب چھوٹا سراج دین کہتے ہیں۔ وہ بڑا ہے، ملاں۔" روانی میں وہ پیش امام کا بے تکلفی کا نام بتا گیا تھا اور اب اس بات پر اور خجل ہو رہا تھا۔

بے بے نے اسی دھیمے انداز میں کہا، "بھائی چھوٹے سراج دین! آپ یقیناً ملاں سراج دین کے قریبی دوست ہوں گے۔" وہ بات کاٹ کے جلدی سے بول پڑا، "ملاں تو جی ہم پیار سے کہتے ہیں۔ بڑا عالم فاضل آدمی ہے — ہاں جی، میں اس کا بچپن کا دوست ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تو بھائی چھوٹے سراج دین! آپ اپنے دوست بڑے سراج دین کو سمجھائیں۔ اللہ نے انھیں دین کی سمجھ اور علم دیا ہے۔ وہ اللہ کا کلام پڑھاتے ہیں تو پھر اسی کے مطابق عادات و اطوار بھی رکھیں۔" چھوٹا سراج فوراً بولا، "بی بی! وہ بڑے سوہنے عادات و اطوار کا بندہ ہے۔ آپ یقین کرو۔"

"سنو جی! مجھے بات کرنے دو!" بے بے نے ڈپٹ کے کہا۔ چھوٹا سراج مرعوب ہوا تھا۔ وہ بولی، "سوہنے عادات و اطوار والا بندہ کبھی عورتوں کو دھمکیاں نہیں دیتا، نہ بدکلامی کرتا ہے۔" چھوٹا کہنے لگا، "دیکھیں نا جی، آدمی سے کبھی کبھار کوئی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بندہ بشر جو ہوا۔ کچھ خیال نہ کریں آپ معاف کردیں اسے۔"

بے بے بولی، "اچھا، تم اس کی طرف سے معافی مانگنے آئے ہو؟" وہ ہاں میں سر ہلا کے کہنے

لگا کہ یہی سمجھ لیں آپ۔

''تو ٹھیک ہے۔'' بے بے نے کہا، ''معاف کیا میں نے۔ مگر ایک بات اپنے ملّاں سراج دین کو بتا دینا کہ اس طرف کبھی رخ نہ کریں۔ میں نے بات اپنے تک ہی رکھی ہے۔ آدمی بنے رہے تو آئندہ بھی کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔ ٹھیک ہے، تم جاؤ۔''

چھوٹا سراج منہ کھولے بے بے کو تکے جا رہا تھا، دھیرے سے کہنے لگا، ''وہ تو ٹھیک ہے جی، پر میں اس کو جواب کیا دوں؟'' اس پر بے بے نے جیسے پھر ڈانٹ پلائی کہ کیسا جواب؟ وہ بولا، ''یہی جی رشتے کی بات۔''

بے بے نے اس کی طرف دیکھ کر جیسے مایوسی میں سر ہلایا۔ افسوس کے ساتھ بولی، ''تم کیسے آدمی ہو؟ میں کہہ رہی ہوں کہ میں تمھارے سراج دین کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی اور تم رشتے کی بات پوچھ رہے ہو۔ ارے بندے خدا کے، کہہ دینا مجھے نہیں کرنا اس سے نکاح۔ اب تو خوش ہو؟ اب جاؤ! مجھے کام کرنے دو۔''

چھوٹے سراج دین کے چہرے پر لال رنگ کی تیکھی لہر دوڑ گئی۔ اسے بے بے کے غصے کی سہار تھی پر وہ اس کی حقارت نہ برداشت کر سکا۔ نتھنے پھلا کے بولا، ''بی بی او بی بی! زیادہ اونچا اڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہم شریف ہیں تو شریف ہیں۔ ہم سے ٹیڑھی بات نہیں کر۔ ہاں!''

اور یہ سب بک بکا کے چھوٹا سراج چلا گیا۔ بے بے سمجھی بات ختم ہو گئی۔ مگر بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

دوسرے دن مسجد کو جانے والا پائپ اکھاڑ دیا گیا۔ باہر کی ٹنکی سے پانی لینے والے ایک دم کم ہو گئے۔ جہاں صبح شام مردوں عورتوں کی بھیڑ لگا کرتی تھی وہاں یہ ہو گیا کہ کبھی بہت ضرورت میں کوئی آ کے بالٹی بھر لیا کرتا۔ بے بے کے گھر محلے والوں کا آنا جانا جیسے بالکل بند ہو گیا۔ ایک دن نانا نے صبح ٹھیلا نکالنے سے پہلے گلی میں آ کے بے بے کو آواز دی۔ وہ دروازے پر پہنچی تو نانا نے ہکلا ہکلا کے کہا کہ اب وہ اس کا سودا نہیں لا سکیں گے۔ اسے اب اور کوئی انتظام کر لینا چاہیے۔ بے بے نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے بس... اب مشکل ہے۔ بے بے نے کہا، ''بابا! کوئی بات نہیں آپ نے بہت خیال رکھا، اللہ خوش رکھے۔'' وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ کر چلے گئے۔ اس کے بعد نانا نے ان سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ نہ وہ

ان دونوں کو صبح جگاتے، نہ ٹنکی سے پانی لیتے اور نہ ہی بات کرتے۔ کاکا سلام کرتا تو سر جھکائے جواب دے دیتے۔ بے بے ایک روز مغرب کے بعد کاکے کو لے کے ان کے دروازے پہ گئی۔ کواڑ تھپتھپایا تو پوچھنے لگے کہ کون ہے؟ بے بے بولی، ''میں اور کاکا آئے ہیں'' تو ذرا ٹھہر کر بولے کہ بھئی اس وقت جاؤ تم لوگ، میں وظیفہ پڑھ رہا ہوں۔ بے بے اندر ہی اندر روتی ہوئی واپس آ گئی۔

ایک دن محلے کی ایک بہت بولنے والی عورت کو روک کے بے بے نے پوچھا کہ آخر بات کیا ہے تو اس نے بے دھڑک بتا دیا کہ تم جو دیکھتے ہی دیکھتے جھونپڑی سے پکے مکان میں آئی ہو، یہ جادو جنتر ایسے ہی نہیں ہو گیا۔ ہمیں سب پتا ہے۔ اور لوگ پانی اس لیے نہیں لیتے کہ تمھاری غلط کمائی کی وجہ سے پانی ناپاک ہو گیا ہے۔ بے بے نے اپنی 'غلط کمائی' کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس طرح غلط ہے تو عورت بھنا کے بولی کہ بی بی! بس رہنے دو منہ مت کھلواؤ۔ پیش امام کے ایک جاننے والے نے ایک بندے کو رات میں چوروں کی طرح تمھارے گھر سے نکلتے ہوئے پکڑا تھا۔ دوسرا باہر کھڑا تھا، وہ شور سن کے ڈپٹ لیا، نہیں اتنے گواہوں کی گواہی مل جاتی کہ سنگساری میں کوئی دیر نہیں لگتی۔

بے بے تو خالی کرسی اٹھا کر رہ گئی تھی۔ ملّاں سراج دین نے اس پر پوری قوت سے وار کیا تھا۔ بعد میں کسی دوسری نے یہ تصدیق بھی کی کہ جو آدمی پکڑا گیا تھا اس نے نانا اور پیش امام کے سامنے اقبالِ جرم کیا ہے۔ اور پیش امام کل کہہ رہا تھا کہ وہ مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر حلف اٹھانے کو تیار ہے کہ بڑی سڑک کے ایرانی ہوٹل کا مالک تجھے پیسے لیے بنا خوب مٹھائیاں بھیجتا ہے۔ عورت نے یہ بھی کہا کہ اس میں ذرا بھی جو غیرت ہو تو ڈوب مرے۔

بے بے اس روز دیوار پکڑے پکڑے گھر میں آئی اور لیٹ گئی۔ وہ صبح تک بخار میں پڑی ہذیان بکتی رہی۔ کاکا اس کی پٹی سے لگا بیٹھا سب سنتا اور کافی کچھ سمجھتا رہا۔

اور ابھی فجر میں دیر تھی جو کاکا گلی میں آیا۔ اس نے پیش امام کو اپنے حجرے میں لالٹین جلاتے دیکھا۔ وہ غلیل اور ایک چھوٹا پتھر لینے گھر میں گھسا اور — اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا — مگر باہر آ کر اس نے پیش امام پر پتھر کھینچ مارا۔ حجرے میں آگ پھیل گئی اور وہ ہوا جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔

اور اب میں، عون محمد وکیل، اپنی سی کوشش کر رہا ہوں کہ سچ سامنے آئے اور کاکا بے حرمتی کے

الزام سے بری ہو جائے۔

مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں، کسی دن جیل کے باہر، دو چار سو یا اس سے کچھ کم (یا زیادہ) خوب غصہ دلائے ہوئے مسلح (اور غیر مسلح) لوگ نہ آ کھڑے ہوں جنھیں سوہنے نبیؐ جی کی لائی ہوئی رحمتوں والی شریعت کی (اور Circumstantial Evidence کی) یا تو سمجھ ہو یا نہ ہو... تو سوال یہ ہے کہ ایسے میں... کاکے کی جان کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔

خیر... اللہ مالک ہے۔

کِھلتی دھوپ اُجلتے سائے

میں کہانی کار ہوں، وقائع نگار نہیں۔ اگر ہوتا تو اس دربار کے دن، سوادِ بنگالہ کے مقام سلطان پور میں خود کو موجود پاتا اور جو دیکھتا اور سنتا وہ اس طور لکھتا:

کہ درعہدِ بادشاہِ عادل، شیر شاہ خلداللہ مُلکہٗ وسلطانہ، در تاریخ نہصد چہل... (یعنی نو سو چالیس ہجری، مطابق 1533 عیسوی۔ گویا آج سے کوئی چار سو بہتر برس پہلے) میں جو دیکھتا ہوں، وہی درج کرتا ہوں۔

امّا بعد۔ میں سلطان شیر شاہ کو اپنی رعیت اور شاہی عمال کے بیچ مسندِ عدل پر بیٹھے دربار کرتے دیکھتا ہوں۔

میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ، فریادیں سنتے ہوئے، موقعے پر ہی احکام صادر فرما رہے ہیں۔

دیگر یہ کہ معمول کے مطابق فریادوں کی شنوائی میں ایک پہر لگ جاتا ہے۔ مگر اس دن جلد ہی فرصت ہو گئی، کہ زیادہ تعداد میں درخواستیں پیش نہ ہوئی تھیں۔

دو تین معمولی قضیے تھے جنھیں باہم رضامندی سے یا سلطانی فیصلے کے تحت نمٹا دیا گیا۔ چار معاملات ایسے تھے جو قضیے ہی نہ تھے۔ فریادی فرسنگوں سے چل کر صرف اپنے سلطان کے درشن کرنے آئے تھے۔

توان نام نہاد فریادیوں نے اپنے معاملات پیش کیے۔ اس دوران وہ کمالِ عقیدت اور مہر و مروّت سے سلطان شیر شاہ کو دیکھتے رہے۔ بادشاہ نے جو کچھ فرمایا، وہ انھوں نے سنا تو سہی، پہ خدا معلوم سمجھا بھی یا کہ یوں ہی اثبات میں سر ہلا ہلا کے خوش ہولیے اور دعائیں دیتے ہجوم میں جا شامل ہوے۔

خود سلطانِ عادل اور اکثر درباری امرا ان لوگوں کی کیفیت کو سمجھتے ہیں اور ان کی قدر بھی کرتے ہیں۔ تاہم یہ مسئلہ اپنی جگہ ہے کہ ان باتوں میں دربار کا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔

دربار کے بعد سوادِ بنگالہ سے آئے زمیں داران عمدہ اور خاصانِ مملکت کے ساتھ بادشاہ ناشتے پر بیٹھے۔ ناشتا معمول کے مطابق سادہ تھا۔ مرغن اور بہت میٹھی غذاؤں سے سلطان اور ان کے امراء دور رہتے ہیں۔ تاہم وہ پھلوں اور شہد سے تیار کی ہوئی علاقہ رو ہ کی بعض روایتی اشیا پسند کرتے ہیں، جو اس وقت بھی مہیا تھیں۔

آج ناشتے میں برہمنوں کی ایک جماعت شریک ہوئی۔ وہ لوگ سب کے ساتھ ہی دسترخوان پر آبیٹھے۔ ان کا لحاظ کرتے ہوے مطبخ کے اہل کاروں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ ہر قسم کا گوشت، مچھلی اور وہ کھانے جن میں لہسن کا استعمال ہوا ہو، دسترخوان پہ نہ لائے جائیں۔ ویسے بھی سب کو علم تھا کہ یہ آنے والے اپنے دین دھرم کے پابند، اصل نسل برہمن ہیں۔ ایک نوع کی کشادہ دلی، دنیوی تعلیم اور امورِ مملکت کی سوجھ بوجھ نے انھیں بادشاہ کے قریب کر دیا ہے۔

عوام الناس ایسوں کو ''شیر خانی برہمن'' کہہ کر بلاتے ہیں۔ یہ عرف کسی طعنے کے طور پر نہیں دیا گیا ہے بلکہ انھی برہمنوں نے خود کو ایسا کہلانا شروع کیا تھا، سو مقبولِ عوام ہوا۔

تاہم، محض اس بنا پر کہ وہ خود کو ''شیر خانی برہمن'' کہلاتے ہیں، انھیں مراعات کا حق دار نہیں گردانا جاتا۔ دوسری رعیت کی طرح یہ اپنے حق اور کام کی نسبت ہی سے شاہی مراعات یا خوشنودی یا عتاب کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔

ناشتے کے بعد ایک خوش گلو ''شیر خانی برہمن'' نے ہندوی زبان کے مستند شاعروں، کتھا کاروں کی وضع پر اپنا لکھا ایک بارہ ماسہ سنایا جس میں بادشاہ کے انصاف کا بیان تھا اور شیر شاہ سوری کو راجا ہریش چندرا جیسا معدلت گستر اور سچ کی پہچان رکھنے والا حکمراں گردانا گیا تھا۔

وہ برہمن اپنا بارہ ماسہ سنا کر بیٹھا ہی تھا کہ بادشاہ حاضرین سے مخاطب ہوے، فرمایا کہ یہ نوجوان اچھا شاعر بن سکتا ہے۔

نوجوان نے سرو قد کھڑے ہو کر تسلیمات کی تو انھوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، فرمایا، ''صاحبو! یہ نوجوان اچھا شاعر بن سکتا ہے اگر شاہوں، سلطانوں سے دور رہے۔''

مجلس میں سناٹا چھا گیا۔ شیر شاہ نے یہ بات مسکرا کر کہی تھی۔ مگر وہ لوگ خواص میں سے تھے، سلطان کے مزاج آشنا تھے، جانتے تھے کہ انھیں ہر قسم کی قصیدہ خوانی ناپسند ہے۔ نوجوان کے بارے میں جو کہا گیا، بطور تنبیہ کہا گیا ہے۔

مجلس میں ایک طرف بیٹھا ایک بزرگ صورت برہمن دست بستہ اٹھ کھڑا ہوا، بولا، ''مہی پال سوریہ! یہ میرا بھتیجا برسوں سے آرزو کرتا تھا کہ دربار میں پیش ہوگا تو اپنی کبت حضور کے گوش گزار کرے گا۔ یہ بارہ ماسہ اس بھاگیہ وان نے مہینوں پہلے سے لکھ رکھا تھا۔ بھلے نصیب اس کے کہ چند ماہ پہلے پریکشا دے کے بیٹھا تھا تو اب علاقہ بنارس میں نائب امین مقرر ہوا ہے اور حضور کے اقبال کو دعائیں دیتا ہے۔ مہاراج! اَدِھراج! سچ پوچھیے تو اس نے کبت سنا کے اپنی مدت کی آرزو پوری کی ہے۔''

سلطان نے پوری توجہ سے بوڑھے برہمن کی بات سنی، مسکرائے، فرمانے لگے ''درست! اس نوعمری میں نائب امین مقرر ہونے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ نوجوان لائق اور محنتی ہے، سو میری طرف سے اسے شق بنارس میں چہار صد بیگہ زمین مزروعہ انعام دی جاتی ہے۔ اس شرط پر کہ یہ دو برس ختم ہونے سے پہلے راجا ہریش چندرا پر اچھی، پرتاثیر اور سچی کتاب لکھ کر دے گا۔''

نوجوان نے اور اس کے چچا نے فرطِ مسرت میں ہاتھ باندھے اور سر جھکا دیے۔

بادشاہ نے اثبات میں سر ہلایا، بات آگے بڑھائی، فرمایا، ''اگر ایسی کتاب نہ لکھی گئی تو دو برس پورے ہونے پر، عطا کی گئی یہ زمین چہار صد بیگہ سے گھٹا کر دو صد بیگہ کر دی جائے گی۔ تاہم، اس کی نائب امینی برقرار رہے گی۔ یہ اس کی آزمودہ لیاقت ہے، کہ امتحان دے کر اس منصب پر آیا ہے۔''

پہلے نوجوان نے، پھر چچا نے کورنش گزاری۔

سلطان نے حاضرینِ مجلس کو یاد دلایا کہ راجا ہریش چندرا، جن کے ہم پلّہ اس لڑکے نے اپنے

سلطان کو بتایا ہے، بڑے بادشاہ اور اعلا انسان ہوں گے۔ درآنحالیکہ میں، شیر شاہ، ایک سادہ سپاہی ہوں، جسے مشیت نے مسند اور تلوار دے کر بندگانِ خدا کے معاملات سرانجام دینے پر مامور کیا ہے۔

آگے فرمایا، ''صاحبو! دعا کرو تو اپنے اپنے طریق پر فرید خان شیر شاہ سوری کے لیے بھی دعا کرنا۔ اب تمھیں اجازت ہے۔ جاؤ۔''

پھر شاعر کو مخاطب کیا کہ فرزند! جیتے رہے تو دو برس بعد یہیں ملاقات ہوگی۔ راجا ہریش چندرا کی کتاب اپنے ساتھ لانا۔

بوڑھے برہمن اور اس کے بھتیجے نے کورنش دی اور ایک آواز ہو کے کہا، ''تتھاس تو! تتھاس تو!''

سلطانِ عادل نے فرمایا، ''ان شاءاللہ!''

شہرِ مُردگاں — ایک کومپوزیشن

1

سال 1982ء میں پاکستان ٹیلی ویژن کراچی سنٹر نے ایک تاریخی ناول کی ڈرامائی تشکیل کے لیے سیّد سلیم احمد سے اور مجھ سے کہا۔ میں بوجوہ اس ناول کے مندرجات پڑھنے سے قاصر تھا۔ سلیم بھائی نے اپنی خوردنوازی اور کشادہ دلی سے اس معاملے کو یوں حل کیا کہ وہ اس ناول کے ابواب پڑھتے اور مجوزہ سیریل کے ایک ایک اپی سوڈ کی آوٹ لائن سی بنا دیتے۔ میں ڈائریکٹر/پروڈیوسر سید محسن علی سے ہفتے وار میٹنگز کر کے اسکرپٹ تیار کر دیتا تھا۔ اس طرح سیریل ''شاہین'' کی اسکرپٹنگ اور بعد ازاں ریکارڈنگ پایہ تکمیل کو پہنچی۔ یہ سیریل سلیم بھائی کی وضعداری اور میری مالی ضرورت کا شاہکار تھی۔

ناول کے مصنف سے سلیم بھائی مانوس تھے کیونکہ وہ اس کے ایک ناول کی ڈرامائی تشکیل کر چکے تھے۔ مصنف کے منھ کو خون لگ ہی چکا تھا۔ اس نے اپنے fan جنرل ضیاء الحق (طے شدہ شہید اور آخری جنگِ یو ایس ایس آر کے غازی) سے فرمائش کی کہ ٹی وی پر سلیم احمد سے میری فلاں ناول بھی کرا دو۔ جنرل صاحب نے اُس جنرل سے، جو ٹی وی پر بٹھایا گیا تھا، کہلا بھیجا۔ ٹی وی جرنیل نے سلیم بھائی سے رجوع کیا، انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ناول اور میری صحت دونوں کمزور ہیں، کسی اور سے کرا لو۔ مصنف کو سُن گُن ملی، وہ دوڑا دوڑا بڑے جرنیل کے پاس گیا، مختلف

جہادوں کی دہائی دی اور تین چار ہفتے اسلام آباد کے چکر لگائے، جنرل صاحب کا جینا دوبھر کر دیا۔ آخر کار جنرل شہید نے چھوٹے جرنیل کو پہلے عذابِ الٰہی پھر عذابِ اسلام آباد کی وعید دی اور ایک غیر مصدقہ روایت ہے کہ چھوٹے (ٹی وی) جرنیل نے ٹیلی فون پر سیّد سلیم احمد کے گوڈوں کو ہاتھ لگایا، اُس وضع دار سیّد نے ہامی بھر لی۔ پھر مجھے بلا بھیجا، میں اس زمانے میں (حسبِ معمول) کان پر قلم رکھ کے گھر سے نکلا ہوا تھا۔ میں نے اس شرط پر 'کو-رائٹر' بننا قبول کر لیا کہ مجھے اصل تصنیف پڑھنے پر آمادہ/مجبور نہیں کیا جائے گا۔ سلیم بھائی نے کہا، چل ٹھیک ہے، نہیں کیا جائے گا۔ غرض کام شروع ہوا۔ پہلی ملاقات میں مصنف مجھے متکبر اور (اللہ معاف کرے) کم آگاہ لگا۔ میں نے جا و بے جا پنگے لینا شروع کر دیے۔ یہ تک کہا کہ حضرت آپ کے establishment کی مبینہ اسلامی جنگیں بیشتر imperialistic excursions تھیں۔ ہاں، میں نے کہا، بعض اپنے تیوروں میں heroic ضرور ہوں گی۔ اس لیے کہ کئی بار مسلم مجاہدوں نے ہم عصر ویتنامیوں جیسی ''جیوٹ'' سے کام لیا ہے۔ مصنف نے مجھے تقریباً دہریہ اور سرتاسر 'کرشتان' declare کیا اور سلیم احمد پر دباؤ ڈالا کہ مجھے اس کام سے ہٹا دیا جائے۔

سلیم احمد نے کہلا بھیجا کہ کہو تو میں اپنا نام ہٹا لیتا ہوں۔ ویسے یہ سیریل اگر میری نگرانی میں ہونا ہے تو اسے وہ 'کرشتان' ہی کرے گا۔ بعد میں مصنف نے اپنے پبلشر کے اکسانے پر لاہور میں پریس کانفرنس کی اور کہا کہ میں سلیم احمد کے کام سے بہت خوش ہوں تاہم ''وہ دوسرا آدمی'' گڑبڑ کر رہا ہے اور تاریخ کو مسخ کر رہا ہے دیگر یہ کہ بعض معتبر مسیحی حضرات میرے پاس وفد کی صورت میں آئے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ ''اُس دوسرے آدمی'' نے سیریل میں وہ کچھ ڈال دیا ہے جو کتاب میں نہیں ہے۔ اس بات سے پاکستان کی مسیحی برادری شاکی بلکہ برہم ہے (راقم الحروف نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی authority پر اسپینی inquisition کی زیادتیوں کے کچھ نرم واقعات کو بنیاد بنا کر سین لکھے اور شامل کیے تھے)۔ کراچی ٹی وی کے جنرل منیجر نے Britannica کے متعلقہ صفحات فوٹو اسٹیٹ کرا کے اسلام آباد بھیج دیے۔ وہاں سے کسی مسخرے نے فون پر فرمائش کی کہ برٹانیکا سے کچھ اور واقعات سیریل میں شامل کیے جائیں اس طرح سیریل کے ڈرامائی تھرل میں اضافہ ہوسکتا ہے وغیرہ۔

سیّد محسن علی کا خط (تاریخ درج نہیں)

اسد بھائی۔ السلام علیکم!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ واقعی اسد بھائی، آپ نے بڑی محنت اور بڑی کرم فرمائی کی۔ ملاقات پر تفصیل عرض کروں گا۔ اب گزارش ہے کہ ایک تو بقایا سین جعفر میاں کو دے دیں۔ دوسرے مندرجہ ذیل دو سین اور لکھ دیں۔

اضافی سین: ابوداؤد اور ابوعبداللہ کا لوشہ میں ایک سین جس میں ابوعبداللہ ابتدا میں ابوداؤد سے کچھ کچھ ناراض رہتا ہے اور سین کے آخر میں ابوداؤد اس کو راضی کر لیتا ہے۔ اس سین کا اس طرح لکھانے کا سبب یہ ہے کہ ابوعبداللہ جب کستیلیہ میں تھا اس وقت ابوداؤد نے ابوعبداللہ کی رہائی کی کوئی کوشش نہیں کی جبکہ ابوعبداللہ اپنے آپ کو قیدی سمجھتا رہا۔ دوئم یہ کہ ابوداؤد غرناطہ سے بھی بلا اجازت بھاگ گیا تھا۔ یہ دو سبب تھے جن کی وجہ سے ابوعبداللہ کچھ کچھ ابوداؤد سے شاکی ہوسکتا ہے۔ اب جبکہ غرناطہ کے الزغل نے ابوعبداللہ کو لوشہ کا حاکم بنایا ہے تو ابوداؤد لوشہ جا کر کچھ اور پٹی پڑھاتا ہے۔

مطلب یہ کہ قسط نمبر 2 کا جو اختتامی سین آپ نے لکھا تھا، جس میں ابوداؤد، ابوعبداللہ کے سامنے ایک یک طرفہ تقریر کرتا ہے اُس کی جگہ یہ مکالماتی سین آنا چاہیے۔

اضافی سین (ب): ابوداؤد فرڈینینڈ کا سین، جس میں جیسے ہی فرڈینینڈ کو پتا چلتا ہے کہ ابوعبداللہ کو لوشہ کا حاکم بنا دیا گیا ہے وہ، یعنی فرڈینینڈ، ابوداؤد سے ملاقات کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ فوراً ابوعبداللہ کے پاس لوشہ جائے اور اُسے دوستی کے معاہدے پر قائل کرے۔

اسد بھائی! یہ دونوں اضافی سین آپ فوراً لکھ کر کل سہ پہر 3 بجے تک بھیج دیں تاکہ میں کل شام 7 بجے کے قریب ریکارڈ کر لوں۔ باقی باتیں انشاءاللہ ملاقات پر۔

آپ کا نیازمند
محسن علی

2

'Shaheen' An18 episode television Drama Serial written by Salim Ahmed and Asad Muhammad Khan.

میں نے سیریل کا ڈھانچا سلیم بھائی کے layout کے مطابق ترتیب دیا تھا اور اُنھی lines پر اسکرپٹس تیار کیے تھے کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس قسم کی ناولیں اپنے پڑھنے والے کا وژن distort کرنے میں یدِطولیٰ رکھتی ہیں اور مجھے ایک 'co- writer with certain reservations' کا رول ادا کرنا چاہیے۔

میں نے بچپن میں اسلامی تواریخی ناولیں بہت پڑھی ہوں گی جبھی برسوں میرے ذہن میں اسلامی مجاہد کی ایک تصویر یہ بنی رہی تھی کہ خون آلودہ شلوکہ تہبند پہنے گھٹے ہوئے سر کا ایک آدمی لمبی سی تلوار پکڑے گھوڑے پر بیٹھا (یا ویسے ہی دوڑتا ہوا) کفار کو جہنم واصل کرتا چلا جا رہا ہے۔ (Quote: ''سر اور دھڑ کٹ کٹ کر گر رہے تھے'') (No insult intended) بھوپال کے قسائی کچھ اس طرح کے ہوتے تھے — خیر۔

میں پھر کہتا ہوں کہ ''شاہین'' سیریل سلیم بھائی کی محبت اور عالی ظرفی کی چھوٹی سی مثال ہے۔ میں خوش ہوں کہ انھوں نے اس میں میری شمولیت پر اصرار کیا۔ آج تک میں خود کو previleged سمجھتا ہوں کہ سلیم احمد کے من موہنے نام کے ساتھ اٹھارہ ہفتوں تک مجھ کم آگاہ کا نام آتا رہا۔ میں بہت سے سین بعض مخالفتوں کے باوجود سیریل ''شاہین'' میں شامل کرنے میں کامیاب ہوا تھا جس پر اُس وقت مجھے عجب exhileration محسوس ہوتا تھا۔ ایک سین غرناطہ کے capitulation کے بعد کا مجھے آج تک haunt کرتا ہے: رات میں ایک دلق پوش سایہ سا کوچوں میں ایک مجنونانہ مسرت کے ساتھ گشت کر رہا ہے۔ اُسے درویشی رقص کی رِدم پر پڑھنے کو میں نے ایک آزاد نظم دی تھی جو کچھ اس طرح تھی کہ — اے شہرِ بے مثال، اے شہرِ باکمال، اے شہرِ محترم، اے شہرِ ذی حشم وغیرہ۔ نظم غرناطہ شہر کی شان وشکوہ کے بیان سے شروع ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ اپنے narration میں اُداس ہوتی جاتی ہے۔ دلق پوش غرناطہ کے ایک بڑے چوک پر اپنی لاٹھی کے سہارے تھک کر بیٹھتا اور اس بے مثال شہر

کے برباد اور سرنگوں ہونے پر ماتم وگریہ کرتے ہوئے سر پہ خاک ڈالتا ہے پھر اٹھ کے مجنونانہ رقص کرتا ہے کہ الوداع! الوداع! اے شہرِ کم سواد، اے شہرِ بدنہاد، اے شہرِ مُردگاں اے شہرِ مُردگاں اے شہرِ مُردگاں ۔ اداکار قاضی واجد نے heavy getup کے ساتھ دلق پوش کا رول کیا تھا۔ ریکارڈنگ او کے ہوئی تو میں نے سیٹ پر آ کر واجد سے معانقہ کیا۔ اُس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔

اب میں وہ آخری commentary نقل کرتا ہوں جس پر (راوی کی آواز میں) یہ سیریل ختم ہوتا ہے۔

Last and concluding frame of the serial Shaheen.

This commentary was read by a celebrated radio artist-

Reading time: 45 seconds.

راوی: اس معرکے میں بھی، ہمیشہ کی طرح، آگے آگے اُن کا امیر تھا جسے وہ شاہین کہتے تھے۔ پھر وہ تین ہزار سوار تھے جنھوں نے اپنے لیے آزادی کی زندگی اور آزادی کی موت پسند کی تھی۔ یہ اُن کے بیٹے تھے جنھوں نے ایک پسماندہ سرزمین میں تہذیب اور علم و دانش کی فصل بوئی تھی، جو آٹھ سو برس تک اُس کی تاریک مٹی کو روشن کرتے رہے تھے۔ اُس دن وہ میدان میں نکلے اور پھر لوٹ کر نہ آ سکے، کیونکہ وقت تو جابر اور مجبور سبھی کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ بس غیرت مندوں اور عزت داروں کے نام اور اُن کے کام زندہ رہتے ہیں۔ وادیِ الکبیر کے آزاد مردوں کی یہ کہانی انسانی تاریخ اس وقت تک دہراتی رہے گی جب تک غلامی سے انکار کرنے والا ایک بھی آدمی زمین پر اپنے قدم جمائے کھڑا ہے۔ (Part of the script that AMK wrote.)

⁂

A quotation from Lane-Poole's 'Moors In Spain.'

Translated by Hamid Ali Siddiqui Saharanpuri.

قرطبہ کی حالت ایک سرحدی شہر کی حالت سے کم نازک نہیں جو غنیم کے سب سے پہلے حملے کی اٹھتی ہوئی موج کے تھپیڑ سہتا ہے۔

باشندگان رات کو سوتے سوتے اکثر چونک پڑتے ہیں کیونکہ پولی کے خونخوار سوار دریا کے اس

طرف شب خون کرتے ہیں۔ بدنصیب کسانوں کی دردانگیز چیخیں، جن کے مظلوم حلقوں پر ظلم کی تلواریں چلتی ہیں، رات کی خاموشی میں صاف سنائی دیتی ہیں۔

ملک کی حالت مقامِ تباہی میں ہے۔ مصیبتوں پر مصیبتیں مسلسل نازل ہورہی ہیں، قزاقی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے بیوی بچے تک پکڑ کر غلام بنائے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سلطان کے سفلہ مزاج، ضعیف اور محض لاشے ہونے سے رعایا الگ نالاں تھی، فوج الگ شکست مند تھی کیونکہ مدت سے تنخواہیں نہ ملی تھیں۔ صوبے داروں نے خراج دینا بند کر دیا تھا۔ شاہی خزانے بالکل خالی ہو گئے۔ جو روپیا بطور قرض لیا گیا وہ اُن عربی سرداروں کی نذر ہوا جو ابھی تک مدد اور معاونت کے سبز باغ دکھلاتے جاتے تھے۔

قرطبہ کے خاموش اور سرد بازار حسرت سے اپنی گزشتہ تجارت کی گرم بازاری کی یاد دلاتے تھے۔ ماکولات بیش بہا ہوتے ہوے بے بہا ہو گئے۔ کسی فرد کو ایک دم کا بھروسا نہ تھا۔ ہر وقت سب کے دل یاس و ناامیدی سے لبریز رہتے تھے متعصب دیندار یا کہو کہ مُلّا نے جو خلق اللہ کی تباہی کو ایک عذابِ الٰہی اور ابنِ حفصون کو (جلالِ الٰہی کا) چابک تصور کرتے تھے، اپنی جاں گزا پیش گوئیوں سے لوگوں کو الگ لرزا رہے تھے اور کہتے تھے ''افسوس! اے کم بخت قرطبہ! اے دنیا بھر کی آلائشوں اور خرابیوں کے منبع! اے مصائب و تکالیف کے مخرج! اے بے پشت و پناہ، بے یار و مددگار شہر! جب وہ کریہہ المنظر دراز بینی کپتان جس کا پیش اسلامیوں سے اور پشت مشرکوں سے محفوظ ہوگی تیرے سہمے ہوے شہر پناہ کے سامنے آئے گا تب تیری افسوسناک قسمت کا بالکل فیصلہ ہو جائے گا۔''

3

A Comment:

اس کولاج کو کسی بھی comment کی ضرورت نہیں تھی اگر سرسری مطالعہ کرنے والے سے مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ وہ جہاد کے ذکر سے بدگمان ہو کر اور غرناطہ میں میرے دلق پوش کی موجودگی سے، اُس کی نظم شہرِ مردگاں کا حوالہ سن کر اور لین پول کے مندرجہ بالا اقتباس سے کوئی تاثر لے کر ان

شہروں غرناطہ اور قرطبہ کو بغداد اور کابل شہروں کا التباس سمجھ بیٹھے گا۔ مشکل یہ ہے کہ ان دنوں اخبار بہت پڑھا جا رہا ہے۔ ٹی وی ریڈیو بہت دیکھا سنا جا رہا ہے۔

جی نہیں یہ شہر بغداد اور کابل نہیں ہیں۔ وہ بدنصیب شہر تو برسوں سے خود کو قتل کرنے میں مصروف ہیں۔ بسیں گے کب، اجڑیں گے کب۔

قرطبہ کے بے یار و مددگار شہر کو لین پول نے کسی کریہہ المنظر دراز بینی کپتان کی آمد کے خوف سے لرزتے بیان کیا ہے جو اُس بے پشت و پناہ کے سامنے آئے گا اور اُس کی افسوسناک قسمت کا بالکل فیصلہ کر دے گا۔

میرے لیے یہ حوالہ غور طلب ہوتا اگر میں اخبار پڑھتا، ٹی وی یا ریڈیو دیکھتا، سنتا یا اپنی کم فہمی سے دراز بینی کپتان کی آمد کو contemporary معنی پہنانے کی کوشش کرتا۔ یا اپنے خوش منظر الائیز سے خواہ مخواہ بدگمان ہوتا۔

بھائی! میں نے تو ایک پرانے ٹی وی سیریل کی بات سنائی ہے جواب کسی کو یاد بھی نہیں۔

ایک بلیک کومیڈی

میں کہانیاں لکھتا ہوں اور اس بات پہ خوش ہوتا ہوں کہ بہت سے لوگ میری کہانیاں پڑھتے، پسند کرتے ہیں۔ کہانیاں لکھنے کا مجھے کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ ملنا چاہیے، مگر نہیں ملتا۔ وجہ سب کو معلوم ہے۔ اس لیے میں ٹی وی سیریل لکھ کے اپنی روزی کماتا ہوں۔ میں یہ سیریل خوش ہو کے لکھتا ہوں کیونکہ لکھنا بجائے خود ایک کارِخیر ہے۔ جو مجھ سے سیریل لکھواتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ لوگ میرے سیریل دیکھتے، پسند کرتے ہیں۔ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ اس لیے میں یقین سے نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے ہیں اور (مارکیٹ میں یہ بات پھیلا کر) سیریل پر لگے ہوئے اپنے پیسے کو تحفظ دینا چاہتے ہیں۔ شوبز کی ڈانواں ڈول اکونومی میں یہ سب کرتے رہنا ضروری ہوتا ہوگا۔

مجھے پروا نہیں ہے۔ جیسا جیسا میرے کلائنٹ کہتے جاتے ہیں، میں کرتا جاتا ہوں۔ بس کہانی کا پلاٹ اور مکالموں کی زبان straight رکھتا ہوں اور ڈرامے کے تنے ہوئے تار پر خود کو متوازن رکھتے ہوئے (چھتری اٹھائے) بڑھتا چلا جاتا ہوں۔ اس طرح تیرہ قسطوں کی لکھائی پوری ہو جاتی ہے اور میرا کلائنٹ خوش خوش اپنے شوبز بازار میں ''یا قسمت یا نصیب'' کہتا داخل ہو جاتا ہے۔ میں فرصت پایا ہوا 'سفید کالر مزدور' اپنی ڈیسک پہ آ بیٹھتا ہوں اور اپنی (ذاتی) کہانیاں لکھنا شروع کر دیتا

ہوں۔ میں خوش میرا خدا خوش۔

کلائنٹ جانتا ہے کہ مارکیٹ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے خاں صاحب کو۔ یعنی مجھے، کچھ نہیں کرنا۔ یہ میرا 'سردرد' نہیں ہے۔

میرا 'سردرد' اس وقت شروع ہوتا ہے جب سیریل لکھائی کے ہنگام — peak hours — میں میری اپنی کوئی کہانی شدت کے ساتھ آنا چاہتی ہے اور میں اسے بچے کی طرح بہلاتا ہوا باہر کے کمرے سے اٹھا کر نرسری میں پہنچا آتا ہوں کہ ''ابھی یہاں بیٹھو، مہمان چلے جائیں گے تو ہم تم خوب کھیلیں گے۔'' کبھی یہ کوشش کامیاب ہوتی ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کہانی پیچھا نہیں چھوڑتی اور مجھے کسی اور طرح اس معاملے کو نمٹانا ہوتا ہے۔ موقع مل جائے اور کلائنٹ چوکنا نہ ہو تو میں آئی ہوئی کہانی کو سیریل میں incorporate کر دیتا ہوں، گاہک بھی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی اچھی بات ہوئی ہے۔ میرا کام نکل جاتا ہے۔ بعد میں، میں اپنی کہانی کو اس کی موجودہ لوکیشن سے salvage کرتا اور جھاڑ جھٹک کے اپنی ڈیسک پر لاتا ہوں اور مکمل کرتا ہوں۔ کلائنٹ چوکنا... اور بور آدمی ہوا تو یہ سب نہیں ہو پاتا۔ پھر میں بیزار سا ہونے لگتا ہوں۔ لیکن کوئی بھی کارکن اپنے بریڈ اینڈ بٹر سے بیزار ہونا افورڈ نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں خود کو مستعدی سے اپنے کام میں لگا دیتا ہوں، ساتھ ہی ساتھ اپنے کہانی کار خاں صاحب کو (جو بار بار جمائیاں لے کر اس چکی کی مشقت کو بھگتا رہا ہوتا ہے) بہلاتا جاتا ہوں۔

اس وقت میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اسی 'بہلانے' کے بیان میں ہے، مثلاً میں یہ کرتا ہوں کہ کسی مائنر کردار کا پورا نام 'داؤد چیڑ قناتی' یا Peter the Unprepared یا کچھ بھی رکھ دیتا ہوں۔ ہدایتکار پڑھ کے ہنستا ہے اور اپنی کاپی میں اس نام کو عامر، فائز، حامد یا رخسانہ سے بدل لیتا ہے اور پرنٹ کرا لیتا ہے۔ پھر کبھی تو وہ نام کے انوکھے پن کی داد دیتے ہوئے فون پر laughter دیتا ہے یا snigger کرتا ہے۔ سامنے بیٹھا ہو تو مسکراتا ہے یا کچھ بھی مزے دار gesture دے کر خوش کر دیتا ہے اور بات ختم ہو جاتی ہے۔

اس وقت جو سیریل میں لکھ رہا ہوں اس کے ایک درجہ دوم کردار کا نام میں نے نیم بیزاری میں للا رکھ دیا تھا جو کلائنٹ کو اتنا پسند آیا کہ ایک بار جب میں نے اسے افتخار شمسی کہہ کے بلانا چاہا تو

کلائنٹ اور ہدایتکار دونوں نے اصرار کیا کہ للا بہترین نام ہے، یہ شمسی و مسی رہنے دیجیے۔

میں کبھی یوں بھی کرتا ہوں کہ ڈرامے کی ٹرمنالجی میں جسے (mood) کہا جاتا اور باقاعدہ within brackets لکھا جاتا ہے وہاں میں کچھ بھی اپنے حسابوں مزے دار سا لکھ دیتا ہوں، مثلاً یہ لکھنے کی بجائے کہ کردار الف نے بے ڈھنگے پن سے ہنستے ہوئے blah blah کہا... میں لکھ دوں گا کہ الف ہائینا کی طرح ہنسا۔ الف نے GWB کی طرح ایک مقدس طیش میں فرمایا کہ (terrorism کے خلاف ہماری کروسیڈ... وغیرہ) یا الف نے اپنے ایک ایک لفظ کو تھپکتے، اس پر مساس کرتے ہوئے کہا...

by the way لفظ مساس نے مجھے اور ہدایتکار کو ایک بار بہت خفیف کیا تھا۔ خیر، گریمر اسکول کی پڑھی ہوئی سب بچیوں سے یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے منٹو صاحب کو ورناکیولر میں پڑھ ہی لیا ہوگا۔

جو سیریل فی الوقت میں لکھ رہا ہوں اس نے مجھے ہلکان کر دیا ہے۔ موجودہ ہدایتکار کو پروفیشنلی ایک چوکھا ہدایتکار کہا جاسکتا ہے، کس لیے کہ اس نے اسٹیج بھی ڈاریکٹ کیا ہے، نیو wave تھیٹر سے بھی اس کی وابستگی رہی ہے۔ خاصا پرانا چاول ہے۔ خوب نکتے نکالتا ہے۔ مگر سیریل کی لکھائی ختم ہونے میں نہیں آرہی، مہینے گزر گئے ہیں۔ میں اپنی ڈیسک پر جانا چاہتا ہوں، وہ ظالم رستے ڈال کے روکے ہوے ہے۔ میں نے ابتدائی بہلاووں سے خود کو بہت بہلا لیا، اس کی موجودگی میں جمائیاں لے لے کے تھک گیا میں۔

تاہم سیریل کا خاتمہ ابھی ایک ڈیڑھ ماہ دور ہے۔

میں خود کو بہلانے کے لیے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے لگا ہوں۔

سیریل کی کہانی کا ویلن ایک جعلی investment firm کا مالک گفا (Guffaw) بھائی ٹین ٹپڑ والا پولیس کی اعانتِ مجرمانہ سے underground چلا جاتا ہے۔ اس کی بددیانتی سے برباد ہونے والا ایک نوجوان، گفا بھائی ٹین ٹپڑ کے گرگے للا بھائی کو دھر پکڑنے اور اپنے پیسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ للا شیر دا پترا اپنے boss تک سے بددیانتی کرتا ہے اور یہ جھوٹ بولتا ہے کہ نوجوان نے اپنی چھوٹی سی رقم نہیں چھینی بلکہ سبھی پیسے لوٹ لیے ہیں۔

Guffaw بھائی اپنے گرگے للا سے سچ قبلوانے کے لیے، (مجبوراً) اسے اپنے Airconditioned Torture Chamber میں پہنچوا دیتا ہے۔

(اللہ معاف کرے) میں نے یہ سین اس طرح لکھا ہے:

Night. Indoors. Guffaw`s Den (in fact his Airconditioned Torture Chamber) Scene: 9. (L`la is being tortured. Mr. Director! Pl. improvise, as you are good at improvisation & TORTURE, both.)

للا: (سین کھلتے ہی للا کی چیخ سنائی دیتی ہے) بتا رہا ہوں، بتا رہا ہوں گفا بھائی کو بلاؤ... میں سب دے دوں گا، دے دوں گا سب... (روتا ہے)

ٹورچر چیمبر ساؤنڈ پروف بھی ہے۔ وہاں امپورٹڈ strobe lights بھی لگی ہیں۔ للا چیختا ہے تو اس کے high نوٹ پر سرخ لائٹ جھپکتی ہے۔ middling نوٹ پر اورنج اور low نوٹ پر yellow لائٹیں جھپکتی اور عجب دلآویز منظر دکھاتی ہیں۔ ایک طرف دیوار پر انٹرکوم لگا ہے جس پر خوش رنگ، حیات آفریں polka dots کی آرائش ہے۔ اسے دیکھ کر زندگی پر اعتماد بحال ہوتا ہے۔

ماشٹر: (یہ ٹورچر کرنے والوں کا فورمین ہے۔ انٹرکوم پر boss سے کہتا ہے) سر! یہ آپ کو بلا رہا ہے۔ بتا دے گا، کہہ رہا ہے سب دے دوں گا۔

گفا: ادھر ہی لے آ، بزی (busy) ہوں... اور سن! حالت اس کی ٹھیک کر کے لانا تجھے پتا ہے blood shlood دیکھنا میرے کو اچھا نہیں لگتا۔ کیا؟

گفا busy اس طرح ہے کہ وہ بہت بڑے اسکرین پر اپنی تازہ pilgrimage کے روح پرور مناظر دیکھ رہا ہے، جو اس کے پوتے نے گھر کے camcorder پر تیار کیے تھے۔ پوتا خود بھی کبھی اسکرین پر دکھائی دے جاتا ہے۔ وہ کیم کورڈر کے سامنے بھی کھسروں کی طرح move کرتا اور بات بات پر تالی پھٹکارتا ہے۔

-CUT-

N.B. اسکرپٹ کی پہلی ریڈنگ کے موقعے پر سیریل کی proposed female lead نے، جو حاملہ تھی، اوپر لکھا یہ سب کچھ پڑھا تو وہ ہنسی اور ہنستے ہنستے کرسی سے گر گئی اور bleed کرنے لگی۔ اسے

ریہرسل روم سے منتقل کرنے کے لیے ایک مہنگے گائنی اسپتال کی ایمبولینس بلائی گئی۔ شام تک معلوم ہوا کہ مجوزہ female lead (جو کہ حاملہ تھی) اب ویسی نہیں ہے۔ وماعلینا الّا البلاغ۔

پروڈیوسرز کو دوسری female lead کا بندوبست کرنا پڑا مگر جلد ہی production house کے پارٹنرز میں سے کسی ایک حرام زادے کی غیر ضروری توجہ سے وہ حاملہ ہوگئی جس پر پوری یونٹ نے بھنگڑا ڈالا۔ (!The Blundering Bastards)

اس پوری صورتحال سے برہم ہو کر senior most partner نے جو خاصا محتاط اور بیوس آدمی تھا اپنی پارٹنرشپ ختم کردی اور اپنے مالی مفادات اس اداکار کو فروخت کر دیے جو اب تک ٹورچر یونٹ کے foreman کا رول کر رہا تھا۔ اس نے آتے ہی male lead کو فارغ کر دیا اور خود میک اپ پہن کر کیمروں کے آگے آ کھڑا ہوا۔

اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

یونٹ کے لوگوں نے پھر ایک بار بھنگڑا ڈالا۔ (!The Blundering B`s) اور سیریل کا کام تیزی سے نمٹانے لگے۔

گنجے ایڈورڈ کا سورج

چھوٹے بھائی! وسعت اللہ خاں! سلامت باش۔ پہلے تمھارے سوال کا جواب، بعد کو اور باتیں۔

تم نے ن ص کے بارے میں پوچھا ہے تو سنو: ن ص رحمتہ اللہ علیہ کو Business Magante بننے کا پرانا شوق ہے۔ آدمی بہت پیارا ہے۔ پہلے بیس برسوں تک وہ ہم دوستوں کو یہ کہہ کہہ کر دھمکاتا رہا کہ مجھے انگریزی کی paraphrasing اور پارٹس اوف اسپیچ اور idioms سب آتے ہیں اور ضرب الامثال تو اتنی آتی ہیں کہ سنا سنا کے سننے والے کی رُمالی پھاڑ سکتا ہوں۔ کہتا تھا کہ پاکستان کے اردو شاعروں میں انگریزی لفظ green کے سولہ سو محاورے اور تمام موجودات کے genders اگر کسی کو آتے ہیں تو بے شک وہ میں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ڈک کا duckling اور cow کا ox کس طرح کیا جاتا ہے اور کہتا تھا میرے پاس اوکسفرڈ concise ڈکشنری کے سات مختلف ایڈیشنز ہیں... یہ سب باتیں اب یاد دلاؤ تو بھائی ہنستا ہے۔

گویا یہ ہیں ن ص جو بہرحال ایک محبت کرنے لائق دوست ہیں۔ وہ اگر کروڑ پتی بھی ہو گئے تو ہم لوگ ان سے کچھ نہیں کہیں گے۔

دیگر... اپنے شہر میں میرے مختصر قیام کا جو احوال تم نے پوچھا ہے تو صورت حال یہ ہے کہ تمھی چار دوستوں نے لندن شہر سے تعارف کرایا تھا۔ یعنی تم نے جتنا ساؤتھ بینک دکھلا دیا تھا تو (جو بچ

رہا) اس سے کچھ کم، عزیز گرامی ش نے دکھا دیا... اور بھائی رع نے، جو گمان غالب ہے کہ عابد وزاہد آدمی ہیں — نبیذ تک نہیں پیتے ہوں گے — انھوں نے وہ لٹریری لندن دکھایا جو علمائے اوکسفرڈ اور فضلائے کیمبرج کا ملجا و ماویٰ تھا اور ایک عالمِ اجّل فاضل لغت، صاحبِ قاموس، دکتور جونسن غفرلہ، کا شہر خیال تھا اور جونسن کے چمچے میاں بوسویل کا رمنہ تھا کہ جس کی گھاس منڈی (Hay Mkt.) اور پھول بازار کو حضرت برنارڈ شاہ نے (کہ ساداتِ آئرلینڈ میں سے ہیں) اپنے کھیل پگمیلین میں خوب خوب دکھایا ہے۔

پھر بیکر اسٹریٹ، کہ قصہ گویانِ عالم میں بے کراں اسٹریٹ کے عرف سے معروف ہے، اسے میں نے اپنے حوصلے، اپنے قدموں سے پامال کیا اور فرانسیسی ڈھڈّو مادام تساؤ کے مومی مجسموں کو جا دیکھا۔ بھئی اس قدر نزدیک پہنچ گئے تھے تو سوچا لگے ہاتھوں مرحوم و مغفور عزیزی آرتھر کانن ڈائل (سنی مے کی کانن بالا سے کوئی رشتہ نہیں) کے زندہ و جاوید کردار، عیار و پرفن، عمروے ثانی... یعنی میاں شرلک ہومز کا کارخانہ بھی دیکھ لیا جائے۔ سو وہ بھی جناب دیکھا اور برادرم ش نے مشورہ دیا تھا کہ وسطی لندن میں کامن ویلتھ انسٹیٹیوٹ بھی دیکھا چاہیے جہاں آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کے ہونہار فرزند گنجے ایڈورڈ کا سورج ابھی تک نہیں ڈوبا ہے۔ تو جناب وہ انسٹیٹیوٹ بھی جا دیکھا۔ احفظنا! عجب افراتفری تھی۔ کوئی دو سو نر طالب علم اور طالبات اپنے ہوم ورک کی کاپیاں کھولے برٹش ایمپائر (اوں ہوں۔ نا میاں ناں 'ویمپائر' نہیں بھائی! ایمپائر... ایم/ پائر) کا کچا چٹھا درج کرتے تھے۔ یعنی کسی زمانے کے ممالکِ محروسہ — حال کامن ویلتھ کا — گویا بھانت بھانت کی برٹش کلونیل اولادوں کا جغرافیائی محلِ وقوع بنا رہے تھے — ساتھ ہی کامن ویلتھ کی ماں، برطانیہ کی شفقتوں کی تفاصیل درج کرتے جاتے تھے۔ سخت ندامت ہوئی۔ بے چارے بچے!

عظیم الشان ہال کمروں میں بڑے بڑے فیل نشین چارٹ، نقشے، ماڈل نصب تھے جن پر سب سے پہلے تو ہند میں کمپنی بہادر کی ابتدائی فتوحات یعنی وہ روشن چوکیاں دکھلائی گئی تھیں کہ جہاں روایتی بدوی کے روایتی خیمے میں ایک حقیقی اونٹ اپنی گردن پہنچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ پھر جیسے جیسے اونٹ پھیلتا گیا تھا یہ نقشے اور چارٹ بڑے اور چمک دار اور رنگین ہوتے گئے تھے۔ کہیں سنین

کے اندراج سے یاد دہانی کی گئی تھی کہ محض اتنے برسوں میں ہم برصغیر میں وہاں سے یہاں آ پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے ...by virtue of our enterprising Blah Blah (ورچو؟ مائی فٹ!)
افریقی ایشیائی گل گتھنے بچے اور بچیاں یہ سب چارٹ پڑھ اور اتار رہے تھے۔
برادرم! یہ تاریخ نہیں بیان کی جا رہی تھی۔ برطانیہ کی اجڑ چکی glory کا بکھان کیا جا رہا تھا— معصوم بچوں کے سامنے۔

مجھے اپنے قدیم شہر کے کرنل شکر اللہ خاں (یا انجام الدین خاں؟ — I can't recall the correct name of the bum) یاد آ گئے۔ ان کی عمر، کہا جاتا تھا کہ سو برس سے بھی کچھ نکلتی ہوئی تھی — خدا معلوم کتنی نکلتی ہوئی — وہ روز شام کو اپنے پتھر کے شہ نشین پر آرام کرسیاں اور موڑھے ڈلوا دیتے تھے جہاں محلے کے بوڑھے (بشمول دادا جان) ٹہلتے ہوئے جا بیٹھتے۔ کبھی میں بھی دادا کے ساتھ لگ کے چلا جاتا تھا۔ کرنل صاحب اکثر اپنے قدیم شکاروں کے قصے سناتے تھے جو مجھے اچھے لگتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ میرے دادا کم ہی جاتے ہوں گے، شکار سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی (وہ ایک نوع کے conservationist ہوں گے)۔ کبھی کرنل صاحب اپنے بیانیے میں شاید بہک بھی جاتے ہوں گے۔ شاید اسی لیے دادا کو میرا وہاں بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کوشش کر کے کبھی مجھے چلتا بھی کر دیتے تھے۔ کوشش انھیں اس لیے کرنی پڑتی تھی کہ میں ان کا لاڈلا تھا۔ لہراتے اٹھلاتے مسکراتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیتا تھا اور جما رہتا تھا۔ ایک بار کرنل صاحب ٹھیک ٹھاک بہک گئے (اندازہ ہوا کہ وہ اکثر بہکتے ہوں گے)۔ سب نے ان کا بہکنا پسند کیا ہوگا اس لیے کہ لوگ خوب خوش ہو کے وہ سب سن رہے تھے جو کرنل صاحب سنا رہے تھے۔ وہ اپنی کرنیل جرنیل جوانی کے خاص واقعات سنا رہے تھے کہ کس طرح انھوں نے اس چھنال کو (An expletive v. well understood by me!) گرایا اور دبوچ لیا۔ پھر وہ خاصے گرافک اسلوب میں بتانے لگے کہ انھوں نے پون صدی پہلے اس ایک چھنال کو کس کس طرح سے ستایا تھا۔ اچانک کسی کی نظر دادا میاں کے اس پوتے پر پڑی اور کرنل کے exploits سمجھو سب جھاگ بن کے ہوا ہو گئے۔

اس مجلس میں یہ میری آخری نشست تھی۔

Scanned by CamScanner

اب جو برطانیہ عظمیٰ کو (بچوں کے سامنے) اپنی ڈیڑھ دو سو برس پہلے کی بدمعاشیوں کا بکھان کرتے دیکھا تو منھ کا مزہ کڑوا ہو گیا۔ راقم، Visitor`s Book میں مناسب ڈانٹ پھٹکار کر کے اور سراج الدولہ، ٹیپو اور سپاہی بہادر mutiny وغیرہ لکھ کے آ گیا۔

خیر، باقی وقت ٹھیک ٹھاک گزر رہا تھا کہ سرخ ہندیوں کے ملک امریکا سے الف خے وارد ہوا۔ اس نے دیکھا کہ میں بھائی ش کا مہمان ہوں اور دن کا زیادہ حصہ لکھنے پڑھنے میں گزارتا ہوں تو بہت برہم ہوا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مجھے اٹھا سیدھا Soho کے لالہ زار میں جا کھڑا کیا کہ اب جو ہو سو ہو۔ (یعنی یہ کہ ایک اٹھاون برس کے آدمی سے کتنا تقویٰ چاہیے آپ کو؟)

الف خے، کہ 'ہند کو' گویان مملکتِ خداداد کا نہایت باہمت دلیر شیر دل فرزند ہے، بے دریغ لندن کے اس رنڈی بزار میں مجھے لے چلا، کہنے لگا برادرم! تمھیں دعوائے قصہ گوئی ہے اور بے جا شرم وحیا کا یہ عالم ہے کہ تم چھ روز کی طویل مدت اس شہرِ بے مثال میں گزار چکے ہو اور تمھیں فرنگی بیسواؤں اور ان کے سرخ وسپید دلّوں (گویا دلالوں) سے تا ہنوز شناسائی نہیں؟ تف ہے برادرِ عزیز! تف ہے۔ آخر تم کہاں کے کہانی کار، افسانہ نگار، قصّہ گو ہو؟

سو بھائی! اس جواں ہمت کے سایہ سایہ میں بھی اس کوچے میں مٹر گشت کرنے لگا (سوال یہ ہے کہ ایک اٹھاون برس کا آدمی، آدمی ہوتا ہے کوئی 'وہ' نہیں ہوتا۔ آپ آخر اس سے کتنے تقوے کا تقاضا کیجیے گا؟)۔ خیر تو پورے پندرہ منٹ ہم سوہو کی ان گلیوں گلیاروں میں بھٹکتے پھرے۔ ایک پختہ رنگ پختہ کار جمائیکن بیسوا کو دیکھا کہ غسلِ آبی/ آفتابی کے انگوری ملبوس میں ایک دروازے میں کھڑی موسیقی کی لے پر بیدِ مجنوں کی طرح ہلنے لرزنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پر عالم کچھ یوں تھا کہ: دیوِ استبداد انگوری قبا میں پائے کوب پائے کوب پائے کوب۔

میں نے بولا کر کہا کہ خواجہ! اس حرام الدہر کے سوا کوئی اور بیسوا نہیں اس کوچے میں؟ تم مجھے یہاں سے نکال کیوں نہیں لے جاتے؟ وہ ہنسا، کہنے لگا، اٹھاون برس کے کسی بھی آدمی کو تقوے کا ناٹک کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی خانا! یارا! تم بدمعاشی کرو اللہ مالک ہے — سب خیر ہے۔ hahaha ایسے فتنہ کار آدمی سے سابقہ پڑا تھا کہ سب تیزی طراری ہوا ہو گئی آپ کے بھائی کی۔ خیر،

ہاتھ جوڑ کے گوڈوں کو ہاتھ لگا کے اسے راضی کیا اور بہ حالِ دگر علاقہ سوہو سے نکلے۔

یہ تو ہوئیں سیر سپاٹے کی باتیں۔ اب کام کی بات سنو میاں! تمھاری وہ فوٹو جس میں تم کانوں پر برقی کنٹوپ چڑھائے کچھ سن رہے ہو، وہ فوٹو میں نے میاں ج الف کی معرفت تمھارے گھر پہنچوا دی ہے۔ تاکید رہے! ہاں... اور وہ دوسری فوٹو (جس میں حضرت شیخ الجامعی الشفیعی غُفرلہٗ کے ساتھ تم کھڑے مسکرا رہے ہو) ابھی کیمرے ہی میں بند ہے۔ سوا دو سو تصویریں کھینچنے، دھلوانے، چھپوانے کے بعد میں ذرا سا جزرس ہو گیا ہوں۔ چنانچہ 16 یا 17 فریم جو اس فلم میں باقی ہیں... وہ نو، دس یا گیارہ اگست کو یہاں سے اٹھ اپنے دارالخلافے جا کر ایکسپوز کروں گا۔ مجھے مشاعرہ پڑھنے جانا ہے۔ کون کہتا ہے یہ آدمی مشاعرے کا شاعر نہیں ہے؟ اب تو مشاعرے ہی کا شاعر ہے یہ ناہنجار۔ مجھے خط لکھو۔ تمھارا کتھارسس ہو گا۔

بھائی! تم نے اب تک لندن میں اپارٹمنٹ خرید لیا ہو گا۔ اللہ مبارک کرے۔ اور اہلیہ تمھاری شاید دسمبر میں عازمِ لندن ہوں گی۔ مبارک باد مزید۔

اوّل تو میں کبھی کبھی کا نکلنے والا، دوسرے خدا معلوم اگلے چند برسوں میں اس طرف آنا ہو گا یا نہیں۔ تاہم تمھاری اس بات سے جی خوش ہوا جو تم نے لکھی ہے کہ ہیتھرو کے ہوائی اڈّے پر دوستوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے یہ فقرہ کہنے کی خفّت سے نجات مل جائے گی کہ لندن میں آپ کا کہاں قیام ہے؟

یہ تمھاری تہذیب اور محبت ہے جو اپنے احباب کے سلسلے سے ایسا سوچتے ہو۔

ہاں یہ بتاؤ حضرت رع کیسے ہیں؟ پوچھنا میرا خط انھیں ملا یا نہیں؟ اور میرا سلام کہنا۔

اتنا ہی لکھ پایا تھا کہ تمھارا نیا ایروگرام ملا۔ سو اس خط کو پورا کرتے ہوئے حوالے ڈاک کرتا ہوں۔

برادرِ عزیز! اب تک دھلوائی گئی تمھاری سبھی تصاویر اچھی آئی ہیں۔ جمع ہوتی جا رہی ہیں۔ جلد بھیج دوں گا۔

جواباً عرض ہے کہ انگلستان کے سفر کی رپورتاژ ابھی لکھنی نہیں شروع کی۔

تاہم جب بھی وہ باتیں لکھی گئیں کچھ اسی طرح کی لکھی جائیں گی جس طرح کی تم ابھی پڑھ کے بیٹھے ہو۔ اب یہ نہیں جانتا کہ لوگوں کو یہ طرزِ بیان بھلا لگے گا یا نہیں۔

کیا کروں۔ لکا چھپا کے کچھ کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ سب باتیں اسی طرح سمجھی تھیں جس طرح
لکھی ہیں اور اسی طرح چھپوا دینا چاہتا ہوں۔ تم اپنی رائے لکھ بھیجو۔

خیر اندیش ۔ تمھارا اپنا۔

جنابِ صدر، گلاب کی پتیاں اور گڑ کیری کا شربت

سطوت اور شکوہ کی تاریخ میری آنکھوں کے بالکل سامنے unfold ہو رہی ہے۔
عظیم جورج ولیم بش کو colonoscopy[1] کے ناگزیر عمل سے گزارا جا رہا ہے۔
نائب السلطنت، عظیم ڈک چینی اس مختصر عرصے کے لیے سریرِ اقتدار پر جلوہ افروز ہیں۔ دنیا بھر
کے مہذب ٹیلی ویژن چینل جنابِ صدر کے ساتھ ہونے والے اس تاریخی عمل کے پل پل کی خبریں
کروڑوں (in fact دسیوں کروڑ) انسانوں کو پہنچا رہے ہیں۔
میں اگر چند برس اور جیا تو اپنے بچوں کے بچوں کو، جو اس وقت تک اور سمجھ دار ہو چکے ہوں گے،
یہ واقعہ اس طرح بتایا کروں گا کہ مشوش دنیا کو جس روز اور جس وقت اس تاریخی واقعے کی لمحے لمحے کی خبر
دی جا رہی تھی، اور دنیا دم بخود تھی اس روز فلاں تاریخ اور یہ وقت تھا اور میں وہاں یا یہاں بیٹھا یہ یا وہ کر رہا
تھا اور میرا وقت اس اس طرح گزر رہا تھا۔ اور دنیا کا موسم اس روز تشویش کا موسم تھا۔
میرے ایک چچا سناتے تھے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جس دن جاپانیوں نے پہلی بار کلکتے
پر بمباری کی تو اس روز اور اس خاص وقت میں وہ ایک زمین کا سودا کرنے موضع کلیا کھیڑی کے بھیا بنسی

1- Colonoscopy: Examination of the large bowel through an instrument inserted into the rectum. The instrument is flexible & can be inserted for a distance of several feet. (The New American Medical Dictionary)

لال گرداور کے پاس پہنچے ہوئے تھے اور ان کی باڑی میں بیٹھے گڑکیری کا شربت پی رہے تھے۔ تاریخ میرے اس چچا کے حلق سے شیشے کے سستے گلاس میں پڑے گڑکیری کے شربت کے ساتھ گھونٹ گھونٹ اتر رہی تھی۔

وقت کے اننت، ادیکھے ٹارمیک پر آدمی کا بچہ کیسی کیسی ٹھوس، چھو کے دیکھنے لائق کھونٹیاں گاڑتا چلا جاتا ہے اور مڑ کے یہ بھی نہیں دیکھتا کہ سبھی کھونٹیاں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں۔

کیا اس طرح نہیں ہے کہ جو جتنے شوکت وثروت وجلال کے چیتھڑے لپیٹے ہوتا ہے وہ اتنا ہی ترتریاں بجاتا، نقاروں پر چوبیں لگاتا اور (کھونٹیوں وونٹیوں کے) یہ سب چونچلے کرتا ہے؟ چاہے اس کی بڑی آنت کے نچلے سرے سے اندر کچھ بھی پہنچایا جا رہا ہو۔

ایک عجیب آدمی سے آپ کو ملاتا ہوں:

چند برس پہلے لکھنے والوں کا ایک ٹھیا تھا، ایک جریدے کا دفتر۔ برابر کے اور اوپر تلے کے کئی کمروں میں اور بھی دفاتر تھے۔ travelling agency، اشتہاری ایجنسی، پبلشر اور اٹرم سٹرم۔ کچھ دفتروں کے مالک خوش حال ہو کر لوکیشن چھوڑ چکے تھے۔ کچھ جیسے تیسے چلے جا رہے تھے۔ بعض بالکل ہی دیوالیہ ہو کر جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے۔ انھی جوتیوں والوں میں ایک صاحب تھے... نام یاد نہیں، آپ انھیں حوصلہ مند کہہ کے پکار سکتے ہیں۔ تو ان حوصلہ مند دوست نے عالمِ شباب میں باپ کے فوت ہونے پر یہاں اسی فلور پر اپنی چھوٹی سی فرم سنبھالی تھی اور اسے اپنے طریق پر چلاتے ہوئے بہت ہی تھوڑے وقت میں برباد کر کے تیزی سے وہاں پہنچ گئے تھے جہاں وہ اس وقت تھے۔ دسیوں علتیں ان کے ساتھ تھیں۔ ایک علتِ خاص جس کا ذکر جریدے کے اہلکار اور مالکان بار بار کرتے تھے وہ تھی رنڈی بازی سے ان کی بے مثال رغبت۔

ایک بار ان کے موجود ہوتے، جریدے کے ایک اہم رکن نے (خود حوصلہ مند کی طرف اشارہ کر کے) مجھے بتایا کہ اس حرام الدہر کی منظورِ نظر ایک بیسوا قیامت کی طرارہ تھی جو بعد کاوشِ بسیار (؟) اس کے ہاتھ آئی تھی۔ اس نے ایک اچھے ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لیا اور بہت اہتمام والتزام سے وہاں شبِ زفاف منائی تھی۔ ایک بات کی وضاحت انھوں نے بہرحال کر دی تھی کہ یہ نتھ اترائی کا کیس نہیں تھا- بات بس اتنی ہی تھی جو سنا دی۔

ہاں- اب یاد آیا کہ جملہ انتظامات میں سے ایک انتظام حوصلہ مند نے یہ کیا تھا کہ ہوٹل کے چھپر کھٹ پہ ایک ڈیڑھ سیر گلاب کی پتیاں بچھوائیں تھیں تب جا کے یہ تاریخی coition عمل میں آیا تھا۔

اب جو میں صدر کے rectal apperture سے متعلق یہ لمحے لمحے کا احوال سناتے networks کے تماشے ہوتے دیکھتا ہوں تو وہ حوصلہ مند جوان یاد آ جاتا ہے جس نے گلاب کی تازہ پتیوں کے ساتھ ایک vulgar-romantic شب بسری کا اہتمام کیا تھا۔

یہ سہ پہر کا اداس کر دینے والا وقت ہے۔ بہت کچھ، سبھی کچھ گڈمڈ ہو رہا ہے۔ طرح طرح کی images آتی اور dissolve ہوتی ہیں۔ سامنے سفید کوٹ پہنے اسٹیتھسکوپ کو گم چھے کی طرح گردن میں ڈالے ایک جواں سال جراح کہ طبیبِ لبیب وہائٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں کیمروں کے سامنے کھڑا ہے اور جنابِ صدر کے بدن کے ساتھ ہونے والے عمل کی تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ میں اور دسیوں کروڑ آدمی جراح طبیب کی گن گن کرتی نندا سی آواز سن رہے ہیں (اور بیچ بیچ میں اونگھتے جاتے ہیں)۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ عمل ہر اعتبار سے چناں ہے اور چنیں ہے۔ جنابِ صدر گلاب کی ایک ڈیڑھ سیر پتیوں میں لتھڑے ہوئے اور گڑ اور کیری کے شربت کو جرعہ جرعہ حلق سے اتارتے ہوئے بہت ہی پُراعتماد ہیں۔ صدرِ محترم نے بڑی حوصلہ مندی سے صدارتی کولہے اٹھائے ہیں اور اپنے نیچے پڑی تاریخِ عالم کو ایک بار گونج کر فرمایا ہے کہ blah blah blah... اور یہاں اس نے نائب السلطنت کی تصدیق سے صدرِ محترم کے porno ارشادات دہرائے جو ٹی وی سیٹ کے دبیز obscene شیشے پر گڑ اور کیری کے مٹ میلے، بنسی لال شربت کی طرح thickly بہنے لگے۔ اس نے کہا...

...that before getting himself under sedation...His Most Bull-Shit Majesty, the president of (almost) the entire world and outer space, in his infinite Wisdom (and ire) decided to let the Yaasir Arafaat phenomenon (also) be tempered with ...surgically. May the cutting edge of his imperialistic intentions hack & cut & sever to suit his unbridled ambitions and libido. Amen.

ارے خدا کے بندو! کوئی اسے بند بھی کردو۔ یہ کب سے کرۂ ارض کے اکیلے پن میں بھن بھن بھن کرتا بجے چلا جارہا ہے۔

سفید گایوں کا میساکر[1]

(اخباری ردّی سے بنایا ایک کولاج)

کالم نگار: وہ قلعہ... ناقابلِ بیان حد تک ایک ہولناک جگہ بن کر رہ گیا ہے۔ آپ اسے جہنم سے تشبیہہ دیں یا لاش گھر کہہ لیں، محاصرے میں آیا ہوا شہر سمجھیں یا کچھ اور: اب یہ مکمل طور پر ایک قتل گاہ یا مذبح بن چکا ہے... واٹر کلر میں ایسے مافوق الفطرت، پُراسرار مناظر کی حامل تصویر، جو غموں سے نڈھال اور تباہ شدہ... (وغیرہ وغیرہ)

⚜

جب میں (کالم نگار) نالہ وشیون کرنے والے مردوزن کے اس بدبخت و بدنصیب جمِ غفیر سے بمشکل تمام گزرا تو صدر اور وزیراعظم سے لے کر قانون کے ادنیٰ اہل کار پولیس مین تک کے لیے آہ وبکا کے ساتھ موت اور لعنت اور پھٹکار کے نعرے بلند ہو رہے تھے... ایک بریگیڈیئر اپنی روزمرہ کی خاکی وردی میں کھڑا تھا۔ وہ 27 مئی کو تین بجے کے لگ بھگ اپنے دستوں کو لے کر پہنچا تھا تاکہ... (وغیرہ وغیرہ)... وہ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ وہ اپنے اُن ساتھی انسانوں میں اور بھی لمبا لگتا تھا جو اپنی خوفناک مصیبت کے بعد دھول اور راکھ بن کر رہ گئے تھے۔

1- قلعے کی دیواروں کے اندر جہاں ہفتۂ سیاہ 26 مئی اور اتوار 27 مئی کو کم سے کم ایک سو پچاس اور زیادہ سے زیادہ دو سو افراد کو بلا وجہ، بلا جواز اطمینان سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

ایک بوڑھی عورت، جو بے قابو ہو چکی تھی بریگیڈیئر سے یہ کہتے ہوئے لپٹ گئی، ''مجھے یہاں مت چھوڑو۔ خدا کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔'' فوجی افسر نے اسے تسلی دیتے ہوئے نرمی سے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔

بعد میں مایوس اور غمزدہ عورتوں کا جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا۔ ان کے چہرے بھوک اور پیاس سے اُترے ہوئے اور غم و اندوہ سے بگڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے بریگیڈیئر کو گھیرے میں لے لیا اور ہر ایک اپنا اپنا دکھڑا سنانے لگی۔ اُن میں سے ایک کی دو بیٹیوں کی آبرو لٹ چکی تھی۔ دوسری کے بچوں کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ ایک اور کے گھر کو لوٹ کر تہ و بالا کر دیا گیا تھا۔ دکھ درد کے ان واقعات کا ذکر چلتا رہا۔ ہر ایک واقعہ پہلے سے زیادہ اذیت ناک اور بھیانک تھا۔ ان میں اِدھر اُدھر تھوڑی بہت مبالغہ آرائی ہو سکتی تھی، لیکن بنیادی حقائق سے کون انکار کر سکتا ہے۔ متذکرہ واقعات میں رتی بھر سچائی بھی ہمیں شرمندگی کی انتہا تک پہنچانے کے لیے کافی ہے۔

بریگیڈیئر کو آہستہ آہستہ مکمل گھیرے میں لے لیا گیا حتیٰ کہ اس کا وہاں سے ہلنا تک مشکل ہو گیا۔

✤

...ظلم و تشدد کے ان واقعات میں 'پولیس کے ہاتھ' کا ذکر اتنا لرزہ خیز تھا کہ اشارتاً کچھ کہنے کے سوا بیان کرنا ایک دل ہلا دینے والی کہانی کی شروعات کو دعوت دینے کے برابر تھا۔

کیا وہ لوگ حقیقتاً اصلی پولیس والے تھے یا ڈاکو اور دہشت گرد پولیس والے بن کر دھوکا دے رہے تھے؟

وہ گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے انھوں نے فائر کیے۔ انھوں نے مقامی مسجد کو توڑ پھوڑ دیا۔ انھوں نے لوگوں کو دھمکیاں دیں کہ اگر وہ اپنے ساز و سامان کے ساتھ اپنے گھروں کو اور شہر کو نہیں چھوڑیں گے تو انھیں بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ جیے سندھ کے نعرے لگا رہے تھے۔ وہ تقسیم کے بعد نقل مکانی کر کے آنے والوں اور اُن کے آبا و اجداد پر دُشنام طرازی کر رہے تھے۔

✤

''کیا آپ کو پتا ہے کتنی موتیں ہوئیں؟'' ایک ڈاکٹر نے بپھرے ہوئے لہجے میں سول افسر سے سوال کیا، پھر خود ہی بولا، ''سو سے زیادہ!... صرف ایک دن میں ایک سو۔ مجموعی طور پر دو سو سے کم نہیں۔''

✤

ہجوم میں سے غصے میں بپھرا ہوا ایک نوجوان نکلا، اس نے دوڑ کر سول افسر کو کار میں بیٹھنے سے روک دیا۔ سول افسر، گالیوں کی بوچھاڑ اور غیظ و غضب کے خوفزدہ کر دینے والے مظاہروں کو بظاہر ثابت قدمی سے برداشت کرنے کے بعد رخصت ہونا چاہتا تھا... مگر بپھرے ہوئے نوجوان نے کار کا دروازہ کسی بے حساب قوت سے اس طرح بند کر دیا جس سے دروازے کو نقصان پہنچا... ایسے لمحات میں کچھ بھی رونما ہو سکتا تھا۔ جلد ہی ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے اس بپھرے ہوئے نوجوان کو واپس کھینچ لیا۔ وہ گالیاں بکتا رہا — متواتر بکتا رہا۔

✤

تھکا ہارا سول افسر، ہم سب کے ساتھ ایک عمدہ لنچ کے لیے یقیناً بیتاب ہو گا لیکن اس کے بجائے بے چارے کو مقامی پریس کے سوالوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا کہ... وہ کس مرض کی دوا ہے اور اپنے اس دورے کے خاتمے پر کیا اقدامات کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ یہ الیکٹرونک میڈیا، خاص طور پر پی ٹی وی، صحیح صورتِ حال کو ٹھیک ٹھیک پیش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا تاکہ اس کی دھماکا خیزی ختم ہو سکے؟ صدر اور وزیرِ اعظم ٹی وی پر آ کر لوگوں کو تسلی کیوں نہیں دیتے؟

✤

Cut to a Prime Minister(Female)

پرائم منسٹر: ''حکومت، دہشت گردوں کا مقابلہ کرے گی، پیچھے نہیں ہٹے گی۔''

✤

پولیس آپریشن کے موقع پر پولیس کی شدید فائرنگ کے بارے میں پولیس کا دفاع کرتے ہوئے پرائم منسٹر نے کہا کہ سکیورٹی ایجنسی پر الزامات غلط ہیں۔ دراصل دہشت گردوں نے عورتوں اور بچوں کو اکسا کر پولیس کے مقابلے میں اپنے لیے ڈھال بنایا تھا۔

✤

Cut to a History of India (Mughal Period)

اورنگزیب عالمگیر نے گول کنڈے کے محاصرے میں سب سے آگے خوب صورت سفید گایوں کی ایک قطار کھڑی کردی تا کہ ہندو، جو گائے کو مقدس جانتے ہیں، محاصرین پر تیراندازی کرنے سے (گایوں کو نقصان پہنچانے سے) باز رہیں۔

چناں چہ گول کنڈے والے باز رہے... اور ہار گئے۔

❦

Cut to a Prime Minister (Female)

پرائم منسٹر: دراصل دہشت گردوں نے عورتوں اور بچوں کو اکسا کر پولیس کے مقابلے میں اپنے لیے ڈھال بنایا تھا— وزیراعظم نے کہا کہ یہ بات بڑی... (وغیرہ وغیرہ) ہے... اگر اپنے علاقے میں امن چاہتے ہیں تو دہشت گردوں کی نشان دہی کر کے انھیں حکومت کے سامنے پیش کریں اور عدالت سے انصاف طلب کریں۔ وزیراعظم نے کہا ''اٹھائیس آدمی مرے ہیں، چودہ ایک دن، چودہ دوسرے دن۔''

Cut to a Senior Federal Minister (Female)

سینئر فیڈرل منسٹر: ''پولیس ایکشن نہایت کامیاب رہا۔ پولیس کے جانی نقصان کے باوجود پہلی مرتبہ پولیس اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ تاہم اس صورت حال سے...'' (وغیرہ وغیرہ)

❦

Cut to a member of the National Assembly (Male)

ایم این اے:... یہ حال ہے کہ میرے علاقے میں چونتیس ڈاکوؤں کی محفل ہوئی، اس میں انسپکٹر پولیس تک بیٹھے، کسی کو سردار بنانا تھا، سردار کے سر پہ پگ رکھنا تھی۔ ایس ایچ او کو پگ ڈالی گئی... جب شادی کی دعوت میں ڈاکو ہاتھ دھونے گئے تو پولیس اہل کار ننکا چلاکران کے ہاتھ دھلوا رہے تھے۔

❦

Cut to a Senior Federal Minister (Female)

سینئر فیڈرل منسٹر: ''پولیس ایکشن نہایت کامیاب رہا، پولیس جانی نقصان کے باوجود پہلی مرتبہ پولیس اپنے مقصد میں کامیاب...'' (وغیرہ وغیرہ)

❦

Cut to a member of the National Assembly (Male)

ایم این اے: ایس ایچ او کو پگ ڈالی گئی... شادی کی دعوت میں ڈاکو ہاتھ دھونے گئے تو... اہل کار ننکا چلاکران کے ہاتھ دھلوا رہے تھے۔

❦

Cut to a Senior Federal Minister (Female)

سینئر فیڈرل منسٹر: ایکشن نہایت کامیاب... پہلی مرتبہ پولیس اپنے مقصد میں...

❦

Cut to a member of the National Assembly (Male)

ایم این اے:... اہل کار ننکا چلاکران کے ہاتھ دھلوا رہے تھے...

❦

Cut to a Prime Minister (Female)

پرائم منسٹر: الزامات غلط ہیں... بس چودہ ایک دن... چودہ دوسرے دن۔

❦

کالم نگار:... لیکن بنیادی حقائق سے کون انکار کرسکتا ہے... متذکرہ واقعات میں رتی بھر سچائی بھی ہمیں شرمندگی کی انتہا تک پہنچانے کے لیے کافی ہے۔

❦

Post-Script:

Cut to two horrifying female voices:

آوازیں: نہایت کامیاب... چودہ ایک دن... چودہ دوسرے دن۔

ایک تحریر... آئی وو آندرِچ

آئی وو آندرِچ، بوسنیا کے گاؤں دولاچ میں 1892ء میں پیدا ہوا۔
آئی وو آندرِچ کے افسانوں، ناولوں کو مشرق اور مغرب کے درمیان پل کی حیثیت حاصل ہے۔

وہ بوسنیا کی زندگی سے اپنی فکشن کا مواد حاصل کرتا اور اس مقامی مواد کو حوالہ بنا کر آفاقی انسانی مسائل بیان کرتا ہے۔ 1961ء میں اسے ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران لکھے گئے اس کے معرکہ آرا ناول ''دریائے درینا کا پل''، ''بوسنیائی کہانی'' اور ''سرائیوو کی عورت'' اس کی بیشتر تخلیقات کی طرح بوسنیا کی زندگی اور اس کے تاریخی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ نقاد انھیں ناول سے زیادہ کرانیکلز کہتے ہیں۔

1941ء میں یوگوسلاویہ پر جرمن حملے کے وقت آندرِچ یوگوسلاویہ کے وزیر کے سفارتی عہدے پر برلن میں تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بلغراد واپس پہنچ گیا اور جنگ کے خاتمے تک گوشہ گیر رہا اور لکھتا رہا۔ اپنی عمر کا بڑا حصہ اس نے بلغراد ہی میں گزارا۔ 13 مارچ 1975ء کو آندرِچ نے وفات پائی۔ اس تحریر

میں آندرِچ اپنے ایک ہم وطن کی ابتلا بیان کرتا ہے۔ تحریر کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے:

موسم بہار کی ایک دل آویز اور حسین صبح میں کریپولائسکو پہاڑی کی ڈھلان پر پارٹیزنوں کا ایک جتھا کھڑا تھا۔ جتھے میں کچھ سرب تھے، ایک مسلمان تھا جس کا نام مصطفیٰ دواڑیا تھا۔ سرب پارٹیزنوں نے بڑی محبت سے کہا، ''ڈیئر کامریڈ! آؤ چلیں۔'' مصطفیٰ ان کے ساتھ چلا گیا، اسے کسی شیطنت کا شبہ بھی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ پارٹیزن اچانک چیتنک بن گئے... اور مصطفیٰ دواڑیا کو انھوں نے ایک مضبوط لکڑی میں زندہ پرو دیا... یہ واقعہ 1942ء میں مئی کی دوسری تاریخ کو ہوا۔

زمین پر شاہ بلوط کی لکڑی کا ایک کھمبا پڑا تھا، ڈھائی میٹر لمبا، اس میں لوہے کی دھاردار شام لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے جب مصطفیٰ کو زمین پر لیٹنے کا حکم دیا تو اس نے سر جھکا دیا۔ چیتنک اس کے پاس گئے، انھوں نے جب مصطفیٰ کا کوٹ اور قمیص اتار پھینکی۔ جیسا کہ کہا گیا تھا پارٹیزن مصطفیٰ خاموشی سے زمین کی طرف منھ کر کے لیٹ گیا۔ انھوں نے اس کی ٹانگوں سے ایک ایک رسّا باندھا پھر دو چیتنکوں نے یہ رسے کھینچ کر اس کی ٹانگیں جتنی چوڑی کھل سکتی تھیں کھول دیں۔ اسی عرصے میں دوسرے چیتنک یووان نے شاہ بلوط کے کھمبے کو لکڑی کے دو لٹھوں پر اس طرح ٹکا کر رکھ دیا تھا کہ اس کی نوک اب مصطفیٰ کی ٹانگوں کے بیچوں بیچ تھی۔ یووان نے اپنی بیلٹ سے ایک مختصر، چوڑا سا خنجر کھینچ لیا اور اوندھے پڑے ہوئے آدمی پر جھک کر اس کی ٹانگوں کے بیچ پتلون کی میانی کا کپڑا کاٹتے ہوئے وہ جگہ چوڑی کر دی جہاں سے کھمبے کو بدن میں داخل ہونا تھا۔ خنجر کے اس چھوٹے سے وار سے بندھے ہوئے آدمی کا جسم ایک بار لرزا۔ اس نے اپنا اوپری بدن ایسے اٹھایا جیسے کھڑا ہونا چاہتا ہو پھر فوراً ہی اسے زمین پر گرا دیا۔ قصّابی کا سب سے دہشت ناک عمل پورا ہو چکا تو یووان اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے مضبوط لکڑی کی ایک موگری اٹھائی اور کھمبے کے نچلے، کند سرے پر آہستہ آہستہ جما جما کر ضربیں لگانی شروع کر دیں۔

وہ رک گیا، اس نے جھک کر پہلے اس بدن کو دیکھا جس میں وہ کھمبا داخل کر رہا تھا۔ پھر دونوں

چیتنکوں کی طرف دیکھا، انھیں یاد دلایا کہ آدمی کی ٹانگیں جھٹکے سے ایک دم نہیں چیر دینی، ہمواری سے آہستہ آہستہ چیرنی ہیں۔ موگری کی ہر ضرب پر اوندھے پڑے ہوئے آدمی کا بدن مٹھی کی طرح بند ہو جاتا، اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی ہو جاتی، کوبڑ بن جاتا مگر رستے کھینچ کر اسے پھر سیدھا کر دیا جاتا۔ وہ زمین پر سر مارتا تو اس کی دھمک آتی تھی، ساتھ ہی ایک بہت عجیب سی آواز سنائی دیتی۔ یہ کوئی چیخ، فریاد یا جانکنی کی خرخراہٹ یا کسی بھی قسم کی انسانی آواز نہیں تھی۔ اذیت جھیلتا، کھینچا اور توڑا جاتا وہ بدن بس ایک چیں چیں کی سی آواز اور ٹکرانے کی دھمک پیدا کر سکتا تھا جسے سن کر لگتا تھا کہیں باڑ کے لیے لکڑی کا لٹھا چیرا جا رہا ہے۔ اب ہر ضرب کے بعد یووان اوندھے پڑے ہوئے آدمی کے پاس پہنچتا، اس پر جھک کر اطمینان کر لیتا کہ کھمبا صحیح سمت میں جا رہا ہے یا نہیں اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اعضائے رئیسہ میں سے کوئی زخمی نہ ہو گیا ہو، وہ اپنا کام پھر شروع کر دیتا۔

ایک لمحے کے لیے ضربیں لگانے کا کام روک دیا گیا۔ یووان نے نوٹ کیا تھا کہ دائیں شانے کے ابھار پر بدن کے پٹھے کھنچ گئے ہیں اور بدنصیب آدمی کی کھال وہاں سے اٹھ رہی ہے۔ وہ تیزی سے گیا، اس نے اپنے خنجر سے اٹھی ہوئی جگہ پر کراس کی شکل میں دو قط لگا دیے۔ زردی مائل خون، پہلے ہلکے ہلکے پھر اور تیزی سے ابل کر بہنے لگا۔

اس نے احتیاط اور آہستگی سے دو تین ضربیں لگائیں اور کھمبے کی لوہا چڑھی نوک قط لگی جگہ سے نکل آئی۔ پھر اس نے جم کے کئی اور ضربیں لگائیں یہاں تک کہ دھاردار شام آدمی کے دائیں کان پر آ گئی۔ آدمی کو کھمبے میں ایسے پرو دیا گیا تھا جیسے باربی کیو کے لیے برہ تیار کیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کھمبے کی شام اس کے منھ سے نہیں پیٹھ سے باہر آئی تھی اور یہ کہ اس کی انتڑیاں، دل اور جگر کوئی بھی زیادہ زخمی نہ ہو پائے تھے۔ یووان نے موگری ایک طرف ڈال دی اور زمین پر پڑے آدمی کے پاس گیا۔ کھمبے کے داخل ہونے کی جگہ سے خون ٹپکتا تھا جس کے چھوٹے چھوٹے ڈبرے بھر گئے تھے۔ ان سے جوتے کپڑے بچاتے ہوئے یووان نے بدن کا جائزہ لیا۔ ساتھ کے دو چیتنکوں نے اکڑے ہوئے بدن کو چت لٹا دیا اور کھمبے سے اس کے ٹخنے باندھنا شروع کر دیے۔ اس وقت یووان دیکھ کر چیک کر رہا تھا کہ آدمی کیا ابھی زندہ ہے۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو اچانک متورم ہو کر اپھر گیا

تھا اور بڑا بڑا لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں بے چین اور پوری کھلی ہوئی تھیں لیکن پلکیں ساکت تھیں۔ ہونٹ ایک طرح کی اینٹھن میں کھنچ کر مڑ گئے تھے جن کے عقب میں بھنچے ہوئے دانت چمکتے نظر آتے تھے۔ آدمی اپنے چہرے کے کچھ عضلات کو قابو نہیں کر پا رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ چہرہ نہیں کوئی نقاب ہے۔ اس کے پھیپھڑے تیزی سے چھوٹے چھوٹے سانس لے رہے تھے۔

دونوں چیتنک اسے ایسے اٹھانے لگے جیسے ککنگ کے لیے تیار کیا گیا گوشت کا ٹکڑا اٹھاتے ہوں۔ یووان ان پر چیخ رہا تھا۔ خبردار کر رہا تھا کہ احتیاط سے اٹھائیں بدن کو ہلائیں جلائیں نہیں، سادھ کے رکھیں پھر وہ خود ان کی مدد کو آ گیا۔ انھوں نے کھمبے کا نچلا موٹا حصہ زمین میں گاڑ دیا۔ سہارے کے لیے پیچھے ایک چھوٹی لکڑی ٹکا دی، اسے کیل لگا کے کھمبے سے ٹھونک دیا۔

پھر تینوں چیتنک گئے اور جتھے کے باقی لوگوں میں شامل ہو گئے۔ خالی جگہ میں مصطفیٰ دوا ٹریا کمر تک ننگا چھاتی نکالے ہوئے زمین سے ایک میٹر بلندی پر کھمبے پر اکیلا رہ گیا۔ پشت پر بندھے بازوؤں اور کھمبے سے بندھے ٹخنوں کے ساتھ دور سے دیکھ کر کوئی مشکل ہی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ کھمبا اس کے بدن کے بیچ سے ہو کر گزرا ہے۔ اب چیتنک اچھی طرح چیک کرتے ہوئے اذیت میں گرفتار اس آدمی کے پاس پہنچے۔ کھمبے پر سے خون کی پتلی کم زور سی دھار بہہ رہی تھی۔ وہ زندہ تھا اور باخبر۔ سانس کے ساتھ اس کے پہلو سکڑ اور پھیل رہے تھے۔ گردن کی نسیں دھڑک رہی تھیں۔ آنکھیں دھیرے دھیرے پھرتی جا رہی تھیں مگر وہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے بھنچے ہوئے دانتوں سے چبا چبا کر غراہٹ جیسی آواز نکال رہا تھا جس کے صرف چند ہی لفظ سمجھ میں آتے تھے، ''چیتنکو! چیتنکو!'' وہ سسکی لے کر کہہ رہا تھا ''تمھیں کتے کی موت نصیب ہو!... کتے کی موت۔''

پارٹیزن: یوگوسلاویا کا مارشل ٹیٹو پارٹیزنوں کا سپریم کمانڈر تھا جنھوں نے 1945ء میں چیتنکوں اور استاشاؤں کو مار لگائی تھی۔ 1980ء میں ٹیٹو کی موت کے بعد، اس کا جما جمایا یوگوسلاویا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سرب چیتنک (یعنی فوجی) اس کے سب ہتھیاروں پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔ دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں ٹیٹو نے فاشسٹوں کے خلاف لڑائی میں سرب چیتنکوں کو دو مرتبہ پارٹیزنوں کا ساتھ

دینے کو کہا تھا۔ وہ کہتے رہے کہ ہاں ہم ساتھ دیں گے۔ لیکن وہ جھوٹ بول رہے تھے۔

چیتنک: فوجی کے لیے استعمال ہونے والے لفظ ''چیتا'' کا مشتق ہے۔ چیتنک اپنی بہت سی خصوصیات سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں، وہ سرب ہیں، وہ بوسنیا والوں کا قتلِ عام کرتے ہیں۔ وہ قتلِ عام کے ذریعے۔ زیادہ صحت کے ساتھ کہا جائے تو۔ وہ ذبح اور ہلاک کر کے، آبروریزی کر کے، آگ لگا کے اور لوٹ مار کر کے ملک بوسنیا کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں۔ چیتنک سرب کاز کے محافظ ہیں اور سرب کاز کا مطلب ہے، آدمیوں، چڑیوں، مچھلیوں، پودوں سب چیزوں کا سرب ہونا۔

تمت بالخیر